ISSN 2321-4627

اگست 2022ء

-/15 روپے

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی وسائنسی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

۷۶ واں جشن آزادی ہند مبارک

بہار کے وزیر اقلیتی بہبود جناب جمعہ خان نے تلنگانہ کے وزیر اقلیتی بہبود جناب کوپولہ ایشور اور وزیر داخلہ جناب محمود علی سے ملاقات کی اور تلنگانہ میں اقلیتوں کو دی گئی ترجیحات کے بارے میں تفصیلات حاصل کیں۔اس موقع پر لی گئی تصویر میں جناب جمعہ خان عزت مآب وزیر اقلیتی بہبود حکومت بہار' جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین ومعذورین حکومت تلنگانہ' جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ' محابس وفائر سرویسیز حکومت تلنگانہ' جناب اے۔کے۔خان عزت مآب مشیر برائے اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ' جناب مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ اسٹیٹ وقف بورڈ' جناب امتیاز الحق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن دیکھے جاسکتے ہیں۔

علحدہ تلنگانہ تحریک کے قائد پروفیسر جے شنکر کی یوم پیدائش کے موقع پر لی گئی تصویر میں تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے عہدیداران واراکین عملہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

www.urduacademyts.com

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 07 شمارہ : 08 اگست 2022ء

زیرنگرانی
محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ایڈیٹر
شاہ نواز قاسم، آئی پی ایس
ڈائریکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی
چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی
حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : 84

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Shah Nawaz Qasim and published by Shah Nawaz Qasim on behalf of Telangana State Urdu Academy Minorities Welfare Dept., Government of Telangana.
Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

قرینہ

ہم کلامی : شاہ نواز قاسم آئی پی ایس ڈائرکٹر/سکریٹری 4

اپنی بات : محمد خواجہ مجیب الدین صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی 5

76 واں جشن آزادی ہند

آزادی ہند میں اردو صحافت کا کردار : ڈاکٹر محمد دانش غنی 6

جس دن ہندوستان آزاد ہوا : مفتی عبدالحلیم خان قاسمی 14

یادرفتگاں

محبوب الخلائق آصف جاہ سادس اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر : ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ 17

خواجہ حیدر علی آتش : ڈاکٹر محمد اکبر 24

شیخ ابراہیم ذوق : مولانا مولوی محمد منیر صاحب منیر لکھنوی 32

مضامین

آثار الصنادید کی افادیت و اہمیت : ڈاکٹر شہناز بیگم 36

خداشناس شہزادی ''جہاں آرا : ڈاکٹر عبدالمغنی صدیقی 43

رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی کی شاعری : ڈاکٹر شاہانہ مریم شان 50

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی تنقیدی خدمات : نظیر احمد گنائی 57

مکرم نیاز کے افسانوی مجموعے ''راستے خاموش ہیں'' : علیزے نجف 62

حفظان صحت

تفریحی سرگرمیوں کی اہمیت : ڈاکٹر روبینہ 67

بچوں کا ادب

جنوبی ہند میں بچوں کی نظمیں، تاریخی جائزہ : ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی 72

صحافت

عزیز الاخبار۔ قدیم حیدرآباد کا نایاب اخبار : ظہیر دانش عمری 76

حصہ نظم

غزلیں : سید مسرور عابدی ۔ منورالنساء منور 80

رئیس صدیقی - مختار ٹونکی 81

عابد رشید - سیف نظامی 82

oOo

www.urduacademyts.com

ہم کلامی

عالی جناب کے۔ چندراشیکھر راؤ عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت تلنگانہ کے احکام کے مطابق جی۔او۔ایم ایس نمبر 36 مورخہ 30/جون 2022ء کے تحت جناب خواجہ مجیب الدین کو تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا صدر نامزد کیا گیا ہے' انہوں نے اپنے عہدہ کا جائزہ بھی حاصل کرلیا ہے۔ موصوف نہ صرف ایک ممتاز قانون داں ہیں بلکہ سماجی' ادبی و سیاسی حلقوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ہم جناب محمد خواجہ مجیب الدین کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ان کی صدارت میں تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی اپنی اسکیمات اور پروگرامس پر سرگرمی کے ساتھ عمل پیرا ہوگی۔

ماہ اگست 2022ء کا ''قومی زبان'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہم نے اس شمارے کی ابتداء 75 ویں جشن یوم آزادی ہند کے ضمن میں دو مضامین آزادی ہند میں اردو صحافت کا کردار اور جس دن ہندوستان آزاد ہوا سے کی ہے۔ اس کے بعد ''یادرفتگاں'' کے تحت سابق تاجدار دکن آصف جاہ سادس اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر کے عوامی اور علمی کارناموں پر ایک مضمون اور ہندوستان کے مشہور شعرائے کرام شیخ ابراہیم ذوقؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ پر بھی سیر حاصل مضامین شائع کئے گئے ہیں۔ شمارے کے دیگر مشمولات میں اساتذہ و اسکالرس کے مضامین' بچوں کے ادب کے تحت ایک مضمون' صحافت پر ایک معلوماتی مضمون شامل ہیں' اسی طرح آخر میں افسانہ اور ممتاز شعرائے کرام کا کلام شائع کیا گیا ہے۔

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی اپنے ترجمان کے ذریعہ اُردو زبان و ادب کے فروغ' ترقی' ترویج و تحفظ کے سلسلہ میں محبان اُردو کی ترغیب کے لئے اس زبان کی اہمیت و افادیت سے واقف کراتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی مادری زبان کی بقا اور ترقی کی کوشش میں ہاتھ بٹائیں۔ جیسا کہ آپ اور ہم جانتے ہیں کہ ہر قوم و خطہ کی اپنی اپنی الگ زبان ہوتی ہے جو ان کی مادری زبان کہلاتی ہے اور مادری زبان ہی آپسی معاملات' تعلقات اور مواصلات کا بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ یوں تو دنیا میں زمین اور آسمان کے درمیان بسنے والے ہر جاندار چرند پرند یہاں تک کہ سمندر میں رہنے والے جانوروں کی اپنی زبان ہوتی ہے اور وہ اس زبان میں ہی اپنی بات سمجھ سکتے ہیں' دوسری زبان میں وہ قطعی کوئی بات نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ان کی اپنی مادری زبان ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ وہ اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کو سیکھ بھی سکتا ہے' سمجھ بھی سکتا ہے اور بول بھی سکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اپنی مادری زبان کو بالکل ترک کردے۔ ہمارے یہاں ہمارے اپنے معاشرے میں آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے کہ ہم نے اپنی مادری زبان کو بالکل ترک کردیا ہے۔ والدین بچوں کو اُردو زبان اس لئے نہیں پڑھا رہے کہ اس سے روزگار جڑا ہوا نہیں ہے' جب کہ زبان کا روزگار سے اور ملازمت سے تعلق نہیں ہونا چاہیے بلکہ زبان کا اپنی تہذیب و تمدن اور کلچر سے تعلق ہوتا ہے' اس لئے والدین کو چاہیے کہ اُردو زبان کو دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ لازمی زبان کے طور پر پڑھائیں تاکہ اپنا تہذیبی ورثہ باقی رہ سکے۔ حکومت تلنگانہ کے عزت مآب وزیر اعلیٰ اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لئے کافی سنجیدہ ہیں' ان ہی کے احکام کے مطابق ساری ریاست میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے اور اس کی عمل آوری کے لئے سرکاری محکموں میں اردو آفیسرس کا تقرر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو اکیڈیمی کے ذریعہ فروغ اُردو کی کئی اسکیمات کو جاری رکھا گیا ہے۔ جن میں مختلف ایوارڈز' ادیبوں شاعروں اور صحافیوں کی مالی اعانت وغیرہ کی جاتی ہے' ان میں سے چھوٹے اردو اخبارات' پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا نمائندوں کو سال 22-2021 کی مالی اعانت جاری کردی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اعلان شدہ اسکیمات جن میں 19'2018 اور 2020 کے کارنامہ حیات ایوارڈز' بیسٹ اردو ٹیچر ایوارڈز برائے سال 20-2019 اور 21-2020' اردو مصنفین کی سال 2020 کی کتابوں کی طباعت کے لئے جزوی مالی اعانت' سال 2019 اور 2020 کی مطبوعہ کتابوں پر انعامات جیسی اسکیمات پر عمل آوری کا کام جاری ہے۔

محبان اُردو سے خواہش ہے کہ حکومت کی دی ہوئی ترجیحات سے فائدہ اٹھائیں اور اردو زبان و ادب کی ترقی ترویج اور تحفظ کی کوششوں میں باہمی اشتراک و تعاون جاری رکھیں اور اپنے زرین مشوروں سے نوازتے رہیں۔

شاہ نواز قاسم' آئی پی ایس
ایڈیٹر

www.urduacademyts.com

اپنی بات

ہمارے ہردلعزیز عزت مآب وزیراعلیٰ عالی جناب کے۔ چندر شیکھر راؤ نے مجھے تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا صدر نامزد کیا اور میں نے ان کے حکم کے مطابق 21۔ جولائی 2022ء کو اُردو اکیڈیمی کی صدارت کا جائزہ بھی حاصل کرلیا ہے۔ میں اس عظیم اعزاز پر جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ صاحب وزیراعلیٰ ریاست تلنگانہ کا مشکور ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کی توقعات پر پورا اتروں اور پیاری اور نیاری زبان اُردو کی حتی المقدور خدمت کروں۔ میں عزت مآب کوپولہ ایشور صاحب وزیر برائے درج فہرست طبقات' اقلیتی بہبود' بہبودی معمرین و معذورین' جناب محمد محمود علی صاحب عزت مآب وزیر داخلہ' محابس و فائر سرویسیز' جناب کے۔ ٹی۔ راماراؤ عزت مآب وزیر برائے بلدی امور' شہری ترقی وانفارمیشن ٹکنالوجی' محترمہ کے۔ کویتا معزز رکن قانون ساز کونسل' جناب وی۔ پرشانت ریڈی عزت مآب وزیر شوارع وعمارات' معزز رکن اسمبلی کاماریڈی جناب گمپہ گوردھن' نظام آباد' کاماریڈی' ریاست تلنگانہ اور شہر حیدرآباد کے تمام پارٹی قائدین وکارکنان کا شکرگزار ہوں جنہوں نے میری عزت افزائی کی۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ماہ اگست ہمارے لئے انتہائی خوشی اور مسرت کا مہینہ ہے اس لئے کہ 1947ء میں اسی ماہ کی 15 تاریخ کو ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔ اس ملک کی آزادی کے لئے ہندو' مسلم' سکھ اور دیگر طبقات کے مجاہدین نے عظیم قربانیاں دی تھیں' ہمارے ہزاروں قائدین' علمائے کرام' اساتذہ' شعرائے کرام اور عوام الناس نے اپنی جان و مال کی قربانی دی' جیلوں کی صعوبتیں برداشت کیں اور برسوں کی جدوجہد کے بعد یہ ملک آزاد ہوا۔ اس آزادی کے صلہ میں ہمیں ہر قسم کی سہولت فراہم کی گئی۔ آزاد ہندوستان کے قانون میں ہر مذہب' ہر فرقہ کی زبانوں' ان کے ثقافتی وتہذیبی اقدار کو مکمل آزادی دی گئی۔ تمام طبقات کو تعلیم' روزگار اور دیگر سہولتیں فراہم کی گئیں۔ اس سال ہم انگریزوں سے آزادی کی 76 ویں سالگرہ منا رہے ہیں۔

اُردو ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی شیرینی لطافت اور سہل فہمی کی وجہ سے یہ زبان سارے ہندوستان میں بلکہ بین الاقوامی طور پر بولی جانے والی زبان ہے۔ اور یہ زبان بلاتفریق مذہب وملت اکثر افراد کی پسندیدہ زبان ہے۔ ہندوستان کے آئین 1950ء کے آٹھویں شیڈول کے تحت اُردو کو دیگر زبانوں کے ساتھ ملک کی زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے ہندوستان کی کئی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ اسی طرح ہماری ریاست کے ہردلعزیز وزیراعلیٰ جناب کے۔ چندرا شیکھر راؤ صاحب کے احکام کے مطابق اردو کو ساری ریاست میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی ہے اور اس کی باضابطہ عمل آوری کے لئے سرکاری دفاتر میں اردو آفیسرس کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی فروغ اردو کے ضمن میں اپنا ایک ادبی رسالہ قومی زبان شائع کررہی ہے جو سارے ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے جس کے ذریعہ حکومت تلنگانہ کے اقلیتوں اور دیگر پچھڑے طبقات کی بہبودی کے پروگرامس واردو زبان وادب کے فروغ کے سلسلہ میں حکومت کی جاری اسکیمات کے بارے میں بھی مطلع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے ذریعہ اردو کے ادیبوں' شاعروں اور قلم کاروں کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی مالی اعانت' اردو دانشوروں ادیبوں' اساتذہ' شعراء اور اردو کاز کے لئے اپنی زندگیوں کو لگانے والوں کو قومی اور ریاستی ایوارڈز' اردو مطبوعات پر انعامات' بیسٹ اردو ٹیچر و بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈز دئے جاتے ہیں اور اردو کے چھوٹے اخبارات کی ہمت افزائی کے لئے سالانہ مالی اعانت' اردو صحافیوں' پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی مالی اعانت' اردو تنظیموں کو مشاعروں' سمینارز اور اردو پروگرامس کے لئے مالی اعانت کی جاتی ہے۔ اسی طرح اردو کی ترقی کی دوسری اسکیمات بھی ہیں جن کی عمل آوری کی جاتی ہے۔ ان میں سے چھوٹے اردو اخبارات' پرنٹ والیکٹرانک میڈیا نمائندوں کو سال 22-2021 کی مالی اعانت جاری کردی گئی ہے۔

میری پہلی کوشش اس بات کی ہوگی کہ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی بقیہ اعلان شدہ اسکیمات کی جلد عمل آوری ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردو ماہرین' اساتذہ' ادیبوں' شعرائے کرام اور محبان اردو سے اردو زبان وادب کے مزید فروغ کے آئندہ اقدامات کے سلسلہ میں مشورہ کیا جائے گا۔

آخر میں میں توقع کرتا ہوں کہ فروغ اردو کے ان ارادوں کو حقیقی روپ دینے آپ سب محبان اردو کا تعاون حاصل رہے گا۔ آپ کے مشورے ہمارے لئے باعث ہمت افزائی ہوں گے۔

محمد خواجہ مجیب الدین

محمد خواجہ مجیب الدین
صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

www.urduacademyts.com

آزادیٔ ہند میں اردو صحافت کا کردار

آزادیٔ ہند کی جو داستان آج کل چھیڑی جاتی ہے اسے سن کر ایسا لگتا ہے جیسے مسلمانوں نے وطن کی آزادی کے لئے کوئی خاص اور نمایاں کردار ادا ہی نہیں کیا جیسے وطن کی جدوجہدِ آزادی میں ان کا قابلِ ذکر کردار ہی نہیں رہا۔ جیسے انہوں نے وطن کی آزادی کے لئے جانی اور مالی قربانیوں کی کوئی مثال ہی قائم نہیں کی ۔جو کچھ کیا وہ یا تو انڈین نیشنل کانگریس (اوراس کے غیر مسلم اکابرین) نے کیا یا پھر دوسرے قوم پرست اور محبانِ وطن غیر مسلموں نے۔ یہ مسلمانوں کا زبردست المیہ ہے۔ان کے ساتھ صریحاً ناانصافی ہے جب کہ اوراقِ تاریخ میں محفوظ واقعات کچھ اور ہی حقائق پیش کرتے ہیں اوران تاریخی واقعات وحقائق کو دوسو برس بیشتر کے صرف اردو اخبار نے ہی نہیں بلکہ انگریزی اور دیگر دوسری زبانوں کے اخباروں نے بھی اپنے دامنِ قرطاس میں محفوظ کر رکھا ہے اور آج بھی یہ اوراق پارینہ برٹش میوزیم اور لندن کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔انگریز آقاؤں، حکمرانوں (لارڈ، گورنر اور دوسرے اعلیٰ افسران) کی ذاتی ڈائریوں، روزنامچوں، یادداشتوں، تاریخی کتابوں اوراس دور کے صحافیوں کی خودنوشتوں اور سوانح حیات پر مبنی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

آزادیٔ ہند کی روداد تو دراصل مغل حکمراں اکبر اعظم کے دور سے شروع ہوتی ہے جب ایک وطن پرست ہندوستانی خاتون حکمراں چاند بی بی نے مغلوں کو غیر ملکی قرار دیا اور مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہوگئی یا جب رضیہ سلطان نے آزادیٔ وطن کا پھریرا لہرایا اور جب شیرِ میسور سلطان حیدر علی اور ان کے جانباز سپوت سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے خلاف صورِ آزادی کو پھونکا' یا جب ۱۷۵۷ء میں شیرِ بنگال پلاسی کے میدان میں انگریزوں سے نبرد آزما ہوا۔

یہ سبھی تاریخی حقائقِ وقت کی وقائع نویسی کے دفتروں میں محفوظ ہیں ۔سلطان ٹیپو کے زمانے کے اخباروں میں محفوظ ہیں اور ۱۸۲۲ء سے باقاعدہ اردو اخباروں میں بھی جدوجہدِ آزادی کا ایک ایک لمحہ محفوظ ہے۔ان ساری شہادتوں کو آزادی کے بعد خودغرض حکمرانوں اور متعصب جماعتوں نے فراموش کر دیا بلکہ حقائق کو چھپانے، مٹانے اور تلف کرنے کی کوششوں میں لگے رہے۔ احسان فراموشی اور فراموش کاری کے اس عمل پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے وطن ہندوستان میں ہمیشہ قومی ہم آہنگی برقرار رہی ہے اور ہماری زمین سے ہمیشہ نیک، مخلص اور صداقت پسند روحوں کا ظہور ہوتا رہا ہے چنانچہ آج بھی حقائق کو سامنے لانے میں غیر مسلم غیر متعصب ہستیاں سامنے آتی رہتی ہیں ۔ بہت سے غیر مسلم ناموں میں موجودہ عہد کے ایک حق پسند کا نام گربچن چندن ہے۔

چندن صاحب محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ سے منسلک رہے ہیں اور انہوں نے اردو صحافت پر گرانقدر تحقیقی

www.urduacademyts.com

کام بھی سرانجام دیئے ہیں۔ انہی کی کدوکاوش اور تحقیق کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ منشی سدا سکھ کا جاری کردہ ہفتہ وار ''جامِ جہاں نما'' ہندوستان میں اردو کا پہلا اخبار تھا جو مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا تھا۔

صحافت نے علم وادب اور تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے لہٰذا صحافت کا مطالعہ گویا گزرے ہوئے واقعات وحقائق کا مطالعہ بھی ہے۔ اردو صحافت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تحریکِ آزادی کے متعدد گوشے ایسے ہیں جن پر فراموشی کی دھول بیٹھ چکی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر ضرورت سے زیادہ توجہ دے کر انہیں اجاگر کیا گیا ہے۔

اردو صحافت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو سماجی اور تہذیبی زندگی کے نہایت روشن پہلو ہماری آنکھوں میں جگمگاتے ہیں جن کی طرف سے ہم نے دانستہ آنکھیں موند رکھی ہیں۔ اسی طرح اردو صحافت کی تاریخ کا مطالعہ یہ حقیقت بھی کھولتا ہے کہ وہ کون سے اہلِ قلم تھے جن کی تحریر وفکر سے علم وادب نے گراں قدر مقام حاصل کیا۔

انیسویں صدی اردو صحافت کا نقطۂ آغاز تھی اور کلکتہ اردو صحافت کا ابتدائی مرکز رہا ہے۔ ۱۷۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مورچہ بندی کا آغاز اسی شہر سے ہوا تھا۔ اس وقت جنگِ آزادی تلواروں سے لڑی گئی تھی اور انگریزوں کے مدومقابل کھڑے ہوکر لوہا لینے کی جسارت کی گئی تھی۔ انگریز حکمرانوں نے شجاعت اور ہتھیاروں کا مقابلہ اپنی مکاری اور عیاری یعنی ذہانت کے بل بوتے پر کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اپنی سعیٔ مذموم میں کامیاب ہوگئے تھے۔

غاصبوں کی فتح اور وطن پرستوں کی شکست نے مقابلہ آرائی کی ایک نئی زمیں اور نئی فضا بنائی اور اب تحریکِ آزادی کی کمان اہلِ قلم کے ہاتھ میں آگئی۔ یہ وہ ہاتھ تھے جن کی انگلیوں کی جنبش سے ان کے قلم دشمن مورچوں پر لگاتار ضربیں لگا رہے تھے اور مقابلہ آرائی کے لئے اپنی تحریروں سے نئے دستے تیار کررہے تھے یعنی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو بھڑکانے میں اردو اخباروں اور صحافیوں نے موثر کردار ادا کیا۔

منشی سدا سکھ کا ''جامِ جہاں نما'' ایک ہفتہ روزہ اخبار تھا اور یہ اخبار اردو صحافت کا نقطۂ آغاز تھا۔ جامِ جہاں نما نے اپنی وطن پسندی کا اظہار کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ اس نے پنجاب پر انگریزوں کے غاصبانہ ارادوں اور سکھ ریاست پر مجوزہ انگریزی حملے کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسی جرم کی پاداش میں اسے معتوب بھی ہونا پڑا۔ حق گوئی اور صداقت آفرینی کی یہ پہلی سزا تھی جو اردو کے پہلے اخبار کو بھگتنی پڑی مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمتیں پست ہونے کی بجائے پُرجوش ہوگئیں۔

کلکتہ ہی سے ''سلطان الاخبار'' اور ''گلشنِ نو بہار'' کے نام سے دو قابلِ ذکر اخبار بھی جاری ہوئے تھے۔ ان میں بھی حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ بعض ہندوستانی اخبار انگریزوں کی خوشامد اور جی حضوری میں لگے ہوئے تھے یہ دونوں اخبار نہایت جرأت اور بے باکی سے انگریزوں کے غیر منصفانہ اور بیجا اقدام کی

www.urduacademyts.com

مخالفت کررہے تھے۔ آزادی کی فضا بنانے میں ان دونوں اخباروں کا بڑا اہم رول ہے۔ خصوصاً ''گلشنِ نوبہار'' نے انگریز مخالفت میں بڑی سبقت لے رکھی تھی اور اسی وجہ سے یہ اخبار انگریزوں کے نشانے پر تھے۔

غدر سے پہلے کے دور میں ان اخباروں نے ہندوستانی اخوت واتحاد کو پیدا کرنے کی خوب خوب سعی کی۔ ان میں شائع ہونے والے مضامین ہندوستانیوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرتے تھے۔ اپنے موقف کے اظہار میں ''گلشنِ نوبہار'' کچھ زیادہ ہی بے باک تھا۔ اسی لئے اس پر کئی مقدمات قائم کئے گئے اور آخر کار پریس ضبط کر کے اخبار کو بند کردیا گیا۔

''صادق الاخبار'' بھی غدر سے پہلے کے اردو اخباروں میں ایک ممتاز روزنامہ تھا۔ اس میں انگریزوں کے ظلم وستم اور ریشہ دوانیوں کی سچی رودادیں شائع ہوتی تھیں۔ ''صادق الاخبار'' کی صداقتیں انگریز حکمرانوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں اس لئے اخبار کو بھی موردِ عتاب قرار دیا گیا۔

''سید الاخبار'' کو سرسید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں صاحب نے جاری کیا تھا۔ ''سید الاخبار'' کے مضامین ذہنی اور فکری بیداری پیدا کررہے تھے۔ یہ اخبار ہم وطنوں میں یک جہتی کو فروغ دے رہا تھا۔ حصولِ تعلیم کے لئے اکسا رہا تھا اور ہندوستانیوں کو انگریزوں میں گھس کر اور ان سے رل مل کر نئی مقابلہ آرائی کے لئے تیار کررہا تھا۔ بظاہر اپنے علمی اور فکری مشمولات کی وجہ سے ''سید الاخبار'' انگریزوں کا کھلا دشمن نہیں تھا۔ سرسید احمد خاں کے مضامین اس اخبار میں پابندی سے شائع ہورہے تھے جو ہندوستانیوں میں حب الوطنی اور وطن پرستی کا شعور اور جوش اندورنی سطح پر پیدا کررہے تھے۔

اس دور کا سب سے مشہور، مقبول اور کثیر الاشاعت اخبار مولوی محمد باقر صاحب کا جاری کردہ ''دہلی اردو اخبار'' تھا۔ گربچن چندن نے مولوی محمد باقر صاحب کو اردو صحافت کا اولین فطری صحافی قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق مولوی محمد باقر ایجاد خو تھے۔ صحافت ان کا فطری جوہر بن گئی تھی۔ انہوں نے اپنے اخبار میں کئی ایسی جدتیں برتیں جن میں جدید صحافت کے رجحان نظر آتے ہیں۔ ہر کالم میں عنوان یا مواد کی دل چسپی پیدا کی اور مضامین کے علاوہ خبروں پر خصوصی توجہ دی۔

مولوی محمد باقر حریت پسند صحافی تھے۔ آزادی کی حمایت ان کا نصب العین تھا۔ انگریز آقاؤں کے ظلم وستم اور ان کے قوانین کے خلاف مولانا نے خوب جم کر لکھا۔ ان کے اداریے ،شذرات اور خبروں پر تنقیدی نوٹ انگریزوں کو خار لگتے تھے۔

غدر کا ہنگامہ شروع ہوا تو انہوں نے حریت پسند سپاہیوں اور مجاہدوں کی ساری خبروں کو بڑے نمایاں طریقے سے شائع کیا۔ انگریزوں کی ہزیمت کی خبریں بھی انہوں نے بڑی بے جگری سے شائع کیں۔ ان کے نزدیک یہ ہنگامہ غدر نہیں تھا بلکہ اعلانِ آزادی تھی۔ جنگِ آزادی کا برملا اظہار تھا اور وہ آزادی کے شعلوں کو ہوا دینے کا فریضہ انجام دے رہے تھے چنانچہ جب انگریزوں نے اپنی مشکلات پر قابو پالیا اور پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہوا تو ''دہلی اردو اخبار'' اور اس کا مدیر خطرناک مجرم قرار پائے۔ گربچن چندن لکھتے ہیں:

www.urduacademyts.com

''وسیع و عریض گرفتاریوں کے ایام میں فرنگی حاکموں نے ستمبر ۱۸۵۷ء میں مولوی محمد باقر کو بھی گرفتار کرلیا تھا اور انھیں باغیوں کو سزا دینے والے افسر اور کمپنی حکومت کے جاسوسی محکمے کے انچارج کیپٹن ہڈسن کے سامنے پیش کیا تھا۔ان کے حکم سے انھیں ۱۶ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی دروازے کے باہر خونی دروازے کے سامنے کے میدان میں توپ کے گولے سے شہید کردیا گیا۔ جس دن انھیں دیگر باغیوں کے ساتھ گولی ماری جانے والی تھی، ان کے فرزند مولوی محمد حسین آزاد اپنے والد کے ایک دوست کرنل سردار سکندر سنگھ کی مدد سے بھیس بدل کر اور ان کا سائیس بن کر دہلی دروازے کے میدان کے باہر کے کنارے سے ان کے آخری دیدار کے لئے گئے ۔ وہاں چاروں طرف فوجی پہرا تھا' مولوی محمد باقر نماز پڑھ رہے تھے ۔آزاد گھوڑے کی باگ تھامے فاصلے پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں ۔مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے نظر اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو دیکھا۔آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔مولوی باقر نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور ساتھ ہی اشارہ کیا کہ بس آخری ملاقات ہوچکی۔اب رخصت۔۔۔۔۔ والد کا اشارہ پاتے ہی سردار صاحب نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور دونوں واپس چلے آئے۔'' (اردو صحافت کا سفر، صفحہ نمبر ۱۷)

اس طرح آزادیٔ ہند میں اپنے قلم سے شعاع حریت جگانے والے جلیل القدر اور مردِ مجاہد صحافی کا خاتمہ ہوگیا۔ان کے اخبار کے ایک ایک شمارے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نذرِ آتش کیا گیا لیکن یہ آگ بجھ نہیں سکی۔مولوی محمد باقر چلے گئے لیکن اپنے پیچھے روشن ہوتی ہوئی مجاہدانہ صحافت کا اجالا چھوڑ گئے۔

۱۸۵۷ء سے قبل کے اخباروں میں ''کوہِ نور'' اخبار بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے ۱۷ر جنوری ۱۸۵۰ء کو منشی ہرسکھ رائے نے ہفت روزہ کی شکل میں جاری کیا تھا۔یہ ایک بنگالی تھے۔انہیں انگریزی حکومت نے اپنے مفاد کے لئے آلۂ کار بنایا تھا۔''کوہِ نور'' نے صحافت کے باب میں بڑی خدمت انجام دی ہے لیکن قوم پرستی اور آزادیٔ ہند میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ کچھ اور بھی ضمیر فروش صحافی تھے جنہوں نے اخبار تو اچھے نکالے مگر انگریزوں کا حقِ نمک ادا کرتے رہے۔

۱۸۵۲ء میں ملتان سے منشی مہدی حسین خاں نے ہفت روزہ ''ریاضِ نور'' جاری کیا تھا۔حب الوطنی اور انگریز مخالفت کی پاداش میں انہیں سات سال کی سزا ہوگئی تھی۔۱۸۵۴ء میں فقیر غلام نصیر الدین کی ادارت میں ملتان سے ''شعاع الشمس'' اور مئی ۱۸۵۴ء میں گجرات سے ''مطلع انوار'' نامی اخبار بھی جاری ہوئے۔یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقریباً سبھی ریاستوں اور مشہور شہروں سے قوم پرست اردو اخباروں کا اجراء ہو چلا تھا اور یہ اخبار حب الوطنی ،قوم پرستی، انگریز دشمنی اور آزادیٔ وطن کی فضا بنا رہے تھے۔رئیس الدین فریدی لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی ہندوستان کے لئے زبردست انقلاب لے کر آئی۔ کانگریس نے جو اس سے پہلے ہی قائم ہوچکی تھی ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنی شروع کی ۔ مسلم لیگ کا قیام، تقسیمِ بنگال کی تجویز ، ایشیاء اور افریقہ پر مغربی ملکوں کی تاخت وتاراج ، کانپور کی مسجد کا واقعہ، ترکی

www.urduacademyts.com

سلطنت کی تباہی کا آغاز، پہلی عالمی جنگ، جلیان والا باغ کی خونریزی وغیرہ نے جمع ہوکر سوراج اور خلافت تحریک کا راستہ ہموار کیا۔اس سے اردو اخبار بھی شدت سے متاثر ہوئے اور نئے نئے اخبار نکلنے لگے۔ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ انگریزوں کی خوشامدی اخبار دب گئے اور اردو صحافت انگریزوں کی مخالفت کے لئے شمشیرِ عریاں ہوگئی یعنی پچاس سال سے بھی کم مدت میں ۱۸۵۷ء کا سماں پھر پیدا ہوگیا۔'' (''اردو صحافت'' مرتب انور دہلوی، صفحہ نمبر ۵۰)

ایک اندازے کے مطابق ۱۸۲۲ء سے ۱۸۹۹ء تک کم وبیش پانچ سو اخبارات ورسائل ملک کے کونے کونے سے جاری ہوئے اور ان میں بیشتر نے تحریکِ آزادی کو پروان چڑھایا۔تحریکِ آزادی ملک کے مختلف گوشوں میں جاری تھی۔ مختلف تنظیمیں اور جماعتیں اپنے اپنے طور پر آزادی کی جدوجہد میں لگی ہوئی تھیں۔اردو صحافت نے جدوجہد آزادی کی علاحدہ کڑیوں کو باہم جوڑ دیا۔اردو اخبارات ورسائل نے ایسے مضامین، اداریے، شذرات، منظوم تخلیقات اور خبروں کو تواتر کے ساتھ شائع کرنا شروع کئے جن سے مجاہدینِ آزادی کو ایک دوسرے کی سرگرمیوں کا پتہ چل جاتا اور ان میں جدوجہدِ آزادی کی امنگ اور تڑپ میں اضافہ ہوجاتا۔

۱۸۵۷ء کے بعد انگریز سرکار نے ایک ایک مجاہد کو چن کر کیفر کردار تک پہنچادیا اور ایک حریت پسند اخبار وصحافی کو ٹھکانے لگادیا تو اس وقت بھی چند ایسے جانباز صحافی موجود تھے جو انگریز حکومت کی نگاہِ عتاب سے بچ گئے تھے اور جنہوں نے اپنی آنکھوں سے محبِ وطن صحافیوں، اخباروں اور مجاہدوں کی تباہی وتاراجی دیکھی تھی۔ان میں سے چند صحافی دنیا کے مختلف ملکوں میں نکل گئے اور وہاں مقیم ہندوستانیوں کو انہوں نے اپنے جاری کردہ اخبارات ورسائل کے ذریعہ جوڑا، یکجا کیا۔محبِ وطن اور حریت پسند مجاہدوں اور شہیدوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا اور اس طرح بیرونی ملکوں میں جاکر آزادئ ہند کی فضا بنائی۔مولانا امداد صابری کے مطابق:

''کسی ملک کی کوئی تحریک اور خاص طور پر وہ تحریک جو کسی غلام ملک کی آزادی کی حمایت میں چلائی جائے، اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک اس کا پروپیگنڈہ اپنے ملک کے علاوہ غیر ممالک میں نہ کیا جائے اور ان کی ہمدردیاں حاصل نہ کی جائیں۔تحریکوں کو چلانے کے تین طریقے جماعتوں کا قیام، اخبارات ورسائل کا اجراء اور تقریروں کا سلسلہ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔چنانچہ ہندوستان سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے پیروکار اور معتقد مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی، شوکت علی، بی اے بنگالی، حضرت مولانا عبیداللہ سندھی، راس بہاری بوس، شیاما جی کرشن، راجہ مہندر پرتاپ اور نیتا جی سبھاش چندر بوس وغیرہ حضرات چین، امریکہ، فرانس، جاپان، جرمنی، ترکی، انگلستان، کینڈا اور اسلامی ممالک میں گئے۔وہاں جماعتیں قائم کیں، اپنی تحریکوں کو چلایا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے۔'' (''اردو صحافت'' مرتب انور دہلوی، ص ۶۳)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترجمانِ شوق (قسطنطنیہ، مدیر و مالک سکندر آفندی)، سلطان الاخبار (ترکی، مدیر و مالک

www.urduacademyts.com

عبدالمجید سلطان)، ہندوستان (لندن، مدیر و مالک راجہ رائے سنگھ)، رسالہ العین (چین، مدیر و مالک مولانا مقبول الرحمٰن)، انڈین سوشلسٹ (لندن، مدیر شیاما جی کرشن ورما) سرکلر آزادی (آرک کینڈا امریکہ، مدیر لالہ امرناتھ)، ماہنامہ اسلامک فرٹیر منسٹی (اخوت اسلامی، ٹوکیو جاپان، مدیر مولانا برکت اللہ بھوپالی)، سوراج (لندن، مدیر بابو بہن چندر پال)، ہندونی (کینڈا) انقلاب (فرانس، مدیر مولانا برکت اللہ بھوپالی)، اخبارِ غدر (سان فرانسسکو، مدیر لالہ ہردیال)، ہفتہ وار جہانِ اسلام (قسطنطنیہ، مدیر ابوسعید) ہفتہ وار الاصلاح (فرانس، مولانا برکت اللہ بھوپالی) جیسے بے باک جریدے شائع ہوئے جنہوں نے ہندوستانیوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور آزادیٔ وطن کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کا جذبہ پیدا کردیا۔ان اخباروں میں مولانا برکت اللہ بھوپالی اور ان کے ساتھیوں کا زبردست حصہ ہے۔یہ وہ مجاہد تھے جن کی صحافت سے انگریز حکومت بوکھلائی ہوئی رہتی تھی۔نیز اپنے سیاسی رسوخ سے کام لے کر ان اخباروں کو بند کروانا چاہتی تھی۔

یہ سبھی اردو اخبارات وجرائد پوری دنیا میں ہندوستانی موقف کو واضح کررہے تھے اور ان کی وجہ سے آزادی پسندوں کو حمایت اور ہمدردی حاصل ہورہی تھی۔دوسری طرف اندورن ملک آزادی کی جدوجہد تیز تر ہوتی جارہی تھی۔بیسویں صدی کے آغاز میں جو ادبی ماہنامے جاری ہوئے ان میں شائع ہونے والے مضامین نثر و نظم سے بھی آزادیٔ ہند کی تحریک کو رفتار ملتی رہی۔منشی دیانارائن نگم کے ماہنامہ زمانہ کانپور میں منشی پریم چند کے وہ ابتدائی افسانے شائع ہوئے جنہیں بعد میں ''سوزِ وطن'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔یہ سبھی کہانیاں حب الوطنی اور حریت پسندی سے رچی ہوئی تھیں اور ان کہانیوں سے جدوجہد آزادی کے جذبات شدید ہورہے تھے چنانچہ انگریز حکومت نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔ علامہ اقبال، مولانا حالی اور انجمن شعرائے پنجاب بھی اپنی نظموں سے قومی بیداری اور جہادِ آزادی کے شعلوں کو بھڑکارہے تھے۔جب یہ نظمیں کسی رسالے میں شائع ہوتیں تو سارے ملک میں ان کی دھوم مچ جاتی تھی۔حریت پسندوں کے جلسے جلوسوں میں ان نظموں کو پڑھا جاتا تھا اور اہلِ وطن میں آزادی کا جوش وجذبہ اور زیادہ موجزن ہونے لگتا تھا۔شعرائے اردو کی وطنی شاعری نے جذبۂ حب الوطنی کو خوب بڑھاوا دیا اور مجاہدین اشعار پڑھتے ہوئے ہر مصیبت کو آسانی سے جھیلتے رہے۔مولانا محمد علی جوہر ایک مذہبی انسان تھے۔انہوں نے اپنی صحافت اور شاعری سے عوام میں مذہب کی بنیاد پر آزادی کے جذبات کو ابھارا۔مولانا محمد علی جوہر نے ''ہمدرد'' جاری کیا۔ ان کے مضامین اور ان کی شاعری نے ان کی صحافت کو بڑی قوت دی اور توانائی بخشی۔وہ آزادی سے کم کسی بات پر راضی نہ تھے چنانچہ جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن تشریف لے گئے تو آپ نے صاف صاف کہہ دیا کہ غلام ملک میں واپس جانا نہیں چاہتا۔ مجھے آزادی کا پروانہ دیجئے یا پھر موت۔اللہ نے ان کی آرزو پوری کردی۔وہ دوبارہ غلام ملک میں واپس نہیں لوٹے۔لندن میں ان کا انتقال ہوگیا

www.urduacademyts.com

اور فلسطین میں ان کی تدفین ہوئی۔ یہ واقعہ بھی اردو صحافت کے ذریعہ ہندوستانی عوام تک پہنچایا گیا اور مولانا کی شہادت نے تحریکِ آزادی میں نئی جان ڈال بھر دی۔

ان ہی دنوں مولانا ظفر علی خاں نے لاہور سے روزنامہ ''زمیندار'' جاری کیا۔ یہ اخبار آغاز ہی سے غلامی کا دشمن اور آزادی کا طلب گار تھا۔ ''زمیندار'' اخبار نے بیس برس تک تحریکِ آزادی کی زبردست حمایت کی۔ انہوں نے انگریزوں اور ان کے حامیوں کے اس طرح پرخچے اڑائے جس کی مثال نہیں ملتی۔ انگریز حکومت ''زمیندار'' سے بہت ڈرتی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں نہایت بے باک اور جرحی صحافی تھے۔ اپنے موقف کے اظہار میں کسی سے دبتے نہیں تھے۔ اس لئے ان کو بار بار قید و بند، اخبار کی ضمانت طلبی اور پریس کی ضبطی کے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔

مولانا ابوالکلام آزاد بھی ایسے ہی مجاہد صحافی تھے۔ وہ غضب کے دانشور اور بلا کے نثار تھے اور اپنی بات کو اس انداز سے اور مدلل طریقے سے پیش کرتے تھے جسے کوئی کاٹ نہ سکتا تھا۔ ان کا شہرۂ آفاق ہفت روزہ ''الہلال'' ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا اور تھوڑے ہی عرصے میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی۔ اس اخبار نے مولانا کی نثر کو وہ اسلوب پیش کیا جو تحریکِ حریت کے اس زمانے میں نہایت مفید اور کارگر ثابت ہوا۔ لیکن اپنی سیاسی تحریروں کی وجہ سے یہ اخبار انگریزی سرکار کے عتاب کا نشانہ بن گیا۔ اس کے بعد ''البلاغ'' اور ''پیغام'' جاری کیے۔ کہتے ہیں مولانا نے تقریباً ایک درجن اخبار اور جریدوں کی ادارت کی اور ہر بار ان کی صحافت حب الوطنی کی شراب سے مخمور رہی۔

۳۰ مارچ ۱۹۱۱ء کو مہاشہ کرشن نے لاہور سے ''پرتاپ'' کا اجراء کیا۔ اسی دن مہاتما گاندھی نے دہلی میں اپنا ''ستیہ گرہ'' شروع کیا تھا۔ پہلے ہی شمارے کی خبریں اتنی ولولہ انگیز تھیں کی سارا پرچہ لاہور ہی میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ اس کے بعد یہ نوزائدہ اخبار کانگریس کی تحریکِ آزادی کا دیو قامت نقیب بن گیا۔ چنانچہ مہاشہ کرشن کا ''پرتاپ'' انگریزی حکومت کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ اس پر دباؤ ڈالا گیا لیکن مہاشے جی نے سنسر شپ قبول کرنے سے انکار کردیا۔

دیوان سنگھ مفتوں بھی ایک زبردست محبِ وطن تھے۔ بڑی مجاہدانہ زندگی گزاری۔ ان کا اخبار ''ریاست'' تحریکِ آزادی کا زبردست آرگن تھا۔ وہ اپنے پیشے کو ایک مشن سمجھتے تھے اور اس نظریے کی ترتیب و تعمیر میں حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات بھرے ہوئے اس عظیم مقصد کے لئے وہ کوئی بھی خطرہ مول لے سکتے تھے۔ اپنے اخبار میں انہوں نے بڑی دلیری اور جرأت مندی کے ساتھ لکھا۔ ان پر کئی مقدمے دائر ہوئے۔ پندرہ مرتبہ گرفتار کیا گیا اور تقریباً آٹھ بار قید و بند کی صعوبت برداشت کی لیکن صحافت سے آزادی ہند کی راہیں کھولنے کا ان کا نصب العین ہمیشہ سلامت رہا۔

مولانا حسرت موہانی ایک بلند پایہ حریت پسند رہنما ہی نہیں ایک بے خوف اور مجاہدِ وطن صحافی بھی تھے۔ ۱۹۰۳ء

www.urduacademyts.com

میں انہوں نے علی گڈھ سے رسالہ ''اردوئے معلیٰ'' جاری کیا اور پہلے ہی شمارے میں ہندوستان کے لئے کامل آزادی کی مجاہدانہ تحریک چھیڑ دی۔ انہوں نے کامل آزادی کے لئے عملی جدوجہد کا بھی آغاز کیا۔ گربچن چندن لکھتے ہیں:

''حریت سے سرشار 'اردوئے معلیٰ' ایک شعلہ بار مجلّہ تھا جس کی تحریروں سے فرنگی حکمرانوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ یہ اپنے آغاز سے قریباً دس سال تک حکومت کے جبر و استبداد کا شکار رہا جس سے اس کی اشاعت کئی بار بند ہوئی۔ نامساعد حالات کے باوجود مولانا حسرت موہانی کسی نہ کسی حالت میں اسے ۱۹۴۲ء تک نکالتے رہے۔'' (''اردو صحافت'' مرتب انور دہلوی، ص ۱۰۰)

منشی دیانرائن نگم اور حسرت موہانی کے اخباروں کے علاوہ لالہ دینا ناتھ کے ''ہندوستان (۱۹۰۴ء)''، ''لالہ لدھارام کے ''سوراج (۱۹۰۷ء)'' مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار (۱۹۰۹ء)''، مہاشہ کرشن کے ''پرتاپ (۱۹۱۱ء)'' اور مہاشے خوشحال خورسند کے ''ملاپ (۱۹۲۳ء)'' میں حب الوطنی کی جو آنچ اور قومی تمازت نظر آتی ہے وہ لالہ لاجپت رائے کی عطا ہے۔ لالہ جی کی دلی خواہش تھی کہ اردو اخبار جاری کریں اور صحافت کے میڈیم سے ملک و قوم کی خدمات انجام دیں۔ وہ مختلف اخباروں میں قومی مسائل پر پابندی سے مضامین لکھتے رہتے تھے لیکن اپنا اردو اخبار شروع کرنے کی تمنا تھی۔ آخر کار انہوں نے ''پنجاب اخبارات اینڈ پریس کمپنی لمیٹیڈ'' کے نام سے مشترک سرمائے والا ایک ادارہ قائم کیا اور ۱۹۲۰ء میں اس ادارے کے زیرِ اہتمام ''روزمانہ بندے ماترم'' جاری کیا۔ اپنی خبروں، مضامین اور تبصروں کی لحاظ سے یہ اخبار پیشہ ورانہ اصولوں کا ایک معیار بن گیا۔ سرکاری خفیہ رپورٹ میں ''بندے ماترم'' کو ایک انتہا پسند اور عدمِ تعاون کا سب سے بڑا اکٹر حامی قرار دیا گیا تھا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے لالہ جی کو کئی بار جیل بھی کاٹنی پڑی لیکن انہوں نے اپنے صحافتی اصول نہیں چھوڑے اور پوری تندہی کے ساتھ آزادیٔ ہند کی تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔ اس عظیم مقصد میں اردو اخبارات، ہفتہ وار، پندرہ روزے اور ماہنامے سبھی لگے ہوئے تھے۔ سیاسی اور ادبی دونوں سطح پر آزادیٔ وطن کے لئے جدوجہد جاری تھی۔ تحریکِ آزادی میں اپنی جانی و مالی قربانیوں کی جھڑی لگانے والے کتنے ہی اردو صحافی اور اخبار و رسائل ہیں جن کی روشن خدمات سے تاریخِ آزادی تابناک ہوگئی۔

ضرورت ہے کہ ہر سال جشنِ آزادی اور یومِ جمہوریہ کے موقعوں پر اردو کے صحافیوں، اخباروں اور رسائل و جرائد کی گرنقدر اور انمول خدمات کو تازہ کیا جائے۔ انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا جائے اور ان کی قربانیوں اور کارناموں کو یاد کر کے نئی نسل کو بھی حب الوطنی قومی یکجہتی، آزادی، مساوات اور انصاف کی راہوں کا اولوالعزم مسافر بنایا جائے۔

○○○

ڈاکٹر محمد دانش غنی
شعبہ اُردو، گوگیٹ جوگلے کر کالج، رتناگری 415612
موبائل: 9372760471

www.urduacademyts.com

جس دن ہندوستان آزاد ہوا

15 اگست 1947 ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب ہمارے ملک ہندوستان نے 200 سالہ برطانوی راج سے آزادی حاصل کی تھی۔ یہ ایک سخت اور طویل اونچی جدوجہد تھی جس میں بہت سے آزادی پسندوں اور عظیم انسانوں نے ہمارے پیارے مادر وطن کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ پندرہ اگست 1947 کو ہندوستان کی برطانوی سامراج سے آزادی کا اعلان کیا گیا اور ہمارا ملک ووٹ پر مبنی نظام والا ملک بن گیا۔

یوم آزادی ہمارے ملک کی سالگرہ کی طرح ہے۔ ہم ہر سال 15 اگست کو یوم آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔ اسے پورے ملک میں قومی تعطیل کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 15 اگست کو پرچم کشائی، مارچ اور سماجی کاموں کے ساتھ ایک عوامی جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسکول، یونیورسٹیاں، کام کی جگہیں، سوسائٹی کی عمارتیں، سرکاری اور نجی انجمنیں اس دن کو بہت اہتمام سے مناتی ہیں۔

یوم آزادی کی تاریخ:

1947 میں اسی دن ہندوستان آزاد ہوا۔ ہم نے سخت جدوجہد کے بعد برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل کی۔ اس دن ہمارے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے پہلی بار لال قلعہ پر قومی پرچم لہرایا۔ اس نے ہندوستان میں 200 سال پرانے برطانوی راج کے خاتمے کو نشان زد کیا۔ اب ہم ایک آزاد اور خودمختار قوم کی حیثیت سے اس ملک میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

انگریزوں نے ہندوستان میں تقریباً 200 سال حکومت کی ہے۔ برطانوی استعمار کے تحت، ہر ہندوستانی کی زندگی جدوجہد سے پُر تھی۔ ہم ہندوستانیوں کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک کیا جاتا تھا اور ہمیں بولنے کی آزادی تک نہیں تھی۔ ہندوستانی حکمران برطانوی افسروں کے قبضے میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ برطانوی کیمپوں میں ہندوستانی جنگجوؤں کے ساتھ ظلم کیا گیا، اور کسان بھوک سے مر رہے تھے کیونکہ وہ فصلیں نہیں بنا سکتے تھے اور انہیں زمین پر خاطر خواہ ٹیکس ادا کرنے کی ضرورت تھی۔ اس خاص موقع پر، ہندوستان کے لوگ ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے عظیم مردوں اور خواتین کی بے لوث قربانیوں اور بے مثال تعاون کو یاد کرتے ہیں۔ یوم آزادی کے موقع پر عظیم مجاہدین آزادی سلطان حیدر علی، ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمود الحسن، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر ذاکر حسین، خان عبدالغفار خان، اشفاق اللہ خان، لال بہادر شاستری، سردار پٹیل، سبھاش چندر بوس، لالہ لاجپت رائے، کنور سنگھ، دادا بھائی نوروز جی، منگل پانڈے، رام پرساد بسمل نانا صاحب چندر شیکھر آزاد، بیگم حضرت محل، رانی لکشمی بائی، بال گنگادھر تلک، گوپال بندھو داس اور لاکھوں مجاہدین کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔

یوم آزادی پر سرگرمیاں:

15 اگست کو ہر سال ملک بھر میں یوم آزادی جوش و خروش سے منایا جاتا ہے۔ لوگ جلسے کرتے ہیں، ترنگا جھنڈا لہراتے ہیں اور قومی ترانہ گاتے ہیں۔ قومی راجدھانی دہلی میں یہ دن بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ تمام وزراء، قائدین اور عام لوگ بڑی تعداد میں لال قلعہ کے سامنے پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہوتے ہیں جہاں وزیر اعظم آتے ہیں اور قومی پرچم لہراتے ہیں، تقریر کرتے ہیں جس میں حکومت کی گزشتہ سال کی کامیابیوں پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔ ان مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے جن پر ابھی بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر غیر ملکی شخصیات کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ جدوجہد آزادی کے دوران اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے آزادی پسندوں کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارا قومی ترانہ "جن گن من" گایا جاتا ہے۔ ہندوستانی

www.urduacademyts.com

فوج اور نیم فوجی دستوں کی پریڈ ہوتی ہے۔تمام ریاستی دارالحکومتوں میں اسی طرح کی تقریبات کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں متعلقہ ریاستوں کے وزیر اعلیٰ قومی پرچم لہراتے ہیں۔

تمام سرکاری و نجی اداروں، سکولوں اور کالجوں میں یوم آزادی انتہائی عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔طلباء پریڈ میں حصہ لیتے ہیں، قومی پرچم لہرایا جاتا ہے۔قومی ترانہ گایا جاتا ہے۔تاریخی عمارتوں کو خصوصی طور پر آزادی کے موضوع کی عکاسی کرنے والی روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔اس دن درخت لگانے جیسے خصوصی پروگرام کیے جاتے ہیں۔نوجوان ذہن حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبات سے لبریز ہے۔یوم آزادی ایک قومی موقع ہے۔اس کی خوشیاں منانے کے لیے اس دن تمام کاروبار، کام کی جگہیں، اسکول اور یونیورسٹیاں بند رہتی ہیں۔کھیلوں اور ثقافتی مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا ہے اور جیتنے والوں کو انعامات سے نوازا جاتا ہے۔سب میں مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ہر گلی کونے میں حب الوطنی کے گیت سنے جاسکتے ہیں۔

جشن کی ایک اور دلچسپ خصوصیت پتنگ بازی ہے جو پورے ملک میں بڑے جوش و خروش سے منعقد کی جاتی ہے۔اس دن آسمان مختلف رنگوں، اشکال اور سائز کی پتنگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ٹی وی چینلز حب الوطنی کے موضوعات پر مبنی فلمیں اور دستاویزی فلمیں ٹیلی کاسٹ کرتے ہیں تاکہ لوگوں اور بچوں کو ہماری جدوجہد آزادی کے مختلف واقعات سے آگاہ کیا جاسکے اور مادر وطن سے محبت کی تحریک پیدا ہوسکے۔تمام قومی اخبارات خصوصی ایڈیشن بھی چھاپتے ہیں اور ان پر لکھی گئی عظیم کتابوں سے عظیم انسانوں کی زندگی کے متاثر کن قصے اور اقتباسات کے حوالے دیتے ہیں۔

یوم آزادی کی اہمیت:

یوم آزادی ہر ہندوستانی شہری کی زندگی کا ایک اہم دن ہے۔سال بہ سال، یہ ہمیں ہمارے عظیم آزادی پسند جنگجوؤں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے ہمارے مادر وطن ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کرانے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اور جدوجہد کی تاکہ ہم آزاد سرزمین میں زندگی گزار سکیں۔ یہ ہمیں ان عظیم تمثیلوں کی یاد دلاتا ہے، جو ایک آزاد ہندوستان کے خواب کی بنیاد تھے، جس کا تصور بانیوں نے کیا تھا اور اس کو پورا کیا تھا۔یہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ ہمارے آباء واجداد نے اپنے حصے کا فرض ادا کیا ہے اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم اپنے ملک کے مستقبل کی تشکیل اور ترقی کیسے کرسکتے ہیں۔انہوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے اور اسے بہت اچھے طریقے سے ادا کیا ہے۔اب ہم پر منحصر ہے کہ ہم اپنا کردار کیسے ادا کرتے ہیں۔

یہ ھے ھماری آزادی جس کے بدلے ھم اپنے ملک ھندوستان میں سکون و چین سے رہ رھے ھیں اور اس آزادی کے صلے میں ھمیں ھر قسم کی سھولتیں فراھم کی گئی ھیں. ھمارے قانون نے ھر مذھب ' فرقہ اور ذات کو مکمل آزادی دی ھے ' ھمیں تعلیم حاصل کرنے ' ملازمتیں حاصل کرنے ' کاروبار کرنے اوراپنے اپنے مذھبی فرائض پورے کرنے کی آزادی حاصل ھے .اس پر ھم شکر کریں اس دنیا بنانے والے کا' اپنے اسلاف کی قربانیوں کی قدر کریں جن کے خون پسینے کی بدولت ھمیں انگریزوں کی غلامی سے آزادی ملی.ھمیں چاھیے کہ اپنے ملک سے سچی وفاداری کریں ' ملک کی ترقی میں مددگار بنیں.اب کی بار ھم "76 واں یوم آزادی" منارھے ھیں' اس کا یھی پیام ھے کہ تعلیم کو عام کریں' جھالت کو مٹائیں.تمام اھل وطن بلاتفریق مذھب و ملت آپس میں میل جول کے ساتھ رھیں...

آزادھندوستان زندہ باد...قومی یکجھتی پائندہ باد.

☆☆☆

مفتی عبدالحلیم خان قاسمی
مکان نمبر: 67-6-10 ' نزد احمدیہ ہوٹل '
فرسٹ لانسر حیدرآباد-28 فون: 9032278657

www.urduacademyts.com

مضامین یادرفتگاں:

نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق والی دکن

تاریخ پیدائش 18 اگست 1866ء

خواجہ حیدر علی آتش

پیدائش 1778ء

خان بہادر شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی

تاریخ پیدائش : 22/اگست 1790ء

www.urduacademyts.com

محبوب خلائق آصف جاہ سادس اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر غفران مکان آصفؔ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبالؔ نے غالباً محبوب خلائق آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خان آصفؔ غفران مکان جیسی ہستیوں کے بارے میں یہ شعر کہا ہوگا جو واقعی اہمیت کی بات ہے اس لئے ایسی ہستیاں ہمیشہ پیدا نہیں ہوتی ہیں بلکہ دستِ قدرت کی فیاضیاں جب عروج پر ہوتی ہیں اور حد درجہ مہربان ہوتی ہیں تو ایسی ہستیوں کا وجود ظہور میں آتا ہے' حقیقت بھی کچھ اس طرح ہے کہ سلطنت آصفیہ کے آصف جاہ خامس نواب میر تہنیت علی خان افضل الدولہ کو چھ صاحبزادیاں تھیں لیکن نرینہ اولاد کی آرزو اور وارثِ تخت سلطنت فکر کی ہمیشہ لاحق رہتی تھی' پدر و سلطانِ وقت' شاہی خاندان اور رعایا کی لاکھوں دعاؤں' مرادوں اور منتوں کے بعد نواب میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ سادس بروز جمعہ' 18/اگست 1866ء تولد ہوئے۔ وارثِ تخت سلطنت آصفیہ کی آمد کی خوشی میں کئی روز تک جشن شاہی منایا گیا' توپوں کی سلامی نے گھن گرج سے مسرت و شادمانی کا اعلان کیا۔ اہل سلطنت شاداں و فرحاں ہوئے۔ روساء و امراء اور حکام سلطنت نے بارگاہ شاہی میں نذریں پیش کیں اور خلعت پائے شعرائے کرام نے کئی تہنیتیں اور تواریخ لکھیں اور انعام و اکرام سے نوازے گئے۔ حضرت شمس الدین فیضؔ نے یہ مقبول تاریخ کہی:

در محل افضل الدولہ بہادر وقت شب — جلوہ گر شد ہمچومہ شہزادۂ عالم پسند
سال تاریخ ولادت عقل کل بافیض گفت — گشت پیدا میر محبوب علی اقبال مند

۱۲۸۳ھ

اصلاحِ فوج: اسی طرح ایک اور قطعہ تاریخ جو زیادہ مشہور ہوا اس کا مادہ تاریخ ''چراغ دکھن'' ہے۔

جانشینی اور مسند نشینی: اہل سلطنت وارث تخت آصف جاہی کی آمد سے ابھی سرشار ہی تھے کہ نواب میر تہنیت علی خان افضل الدولہ آصف جاہ خامس نے ۱۳/ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ داعی اجل کو لبیک کہا۔ اہل سلطنت کی خوشیاں ماند پڑ گئیں اور میر محبوب علی خان صرف دو سال آٹھ ماہ کی عمر میں اپنے ذی قدر مشفق باپ کے سائے سے محروم ہو گئے۔ نواب میر تہنیت علی خان افضل الدولہ آصف جاہ خامس کی تجہیز و تکفین سے قبل فرض شناس و مدبر سلطنت سالار جنگ مدار المہام نے سیاسی حکمت و دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے حسب رواج شہر پناہ کے تمام دروازے بند کروا دیئے اور نواب میر محبوب علی خان نظام آصف جاہ سادس کی تخت نشینی کا اعلان ہوا۔ آصف جاہ خامس کی فاتحہ سوم کے دوسرے دن قصر شاہی میں ۱۵/ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ کو نونہال محبوب دکن نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کی مسند نشینی کا دربار منعقد کیا گیا۔ محل سرا سے شیر خوار جانشین تخت آصفی کو گود میں لئے ایک اصیل برآمد ہوئی۔ شمس الامراء امیر کبیر محمد رفیع الدین نے معصوم نواب میر محبوب علی خان کو اصیل کی گود سے لے کر سالار جنگ کی مدد سے تخت شاہی پر بٹھا دیا۔ جملہ اراکین سلطنت نے نذریں پیش کیں۔ رزیڈنٹ بہادر نے مبارک باد دی۔ نوبت نقارے اور شادیانے بجائے گئے۔ نفیریوں اور شہنائیوں سے سارا شہر گونج اٹھا۔ اس فوری انتظام کے سبب شہر اور مضافات شہر میں مسرت کی لہر دوڑ گئی اور ہر طرح کا امن و سکون قائم ہو گیا۔

مسند نشینی سے قبل ایک اہم واقعہ پیش آیا کہ جس سے حکام سلطنت کی وفا شعاری اور رعایا کی محبت سلطنت آصف جاہی کے تئیں آشکار ہوتی ہے۔ آصف جاہ خامس کے انتقال کے بعد ناراض رزیڈنٹ نے پرسہ دیا اور ساتھ دھمکی بھی دی کہ ہم آصف جاہ سادس کی مسند نشینی کے دربار میں نہیں آئیں گے کیونکہ مسند نشینی کے سلسلے میں ہم کو لاعلم رکھا گیا اور کوئی مشورہ بھی طلب نہیں کیا گیا۔ موقع شناس و بیدار مغز سالار جنگ اور نکتہ سنج شمس الامراء نے حکمت سے کام لیتے ہوئے ناراض رزیڈنٹ کو جواب دیا کہ آئین آصفی میں حاکم سلطنت کو رعایا تسلیم کرتی ہے انگریز حکومت سے استمراج یا استفسار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناراض رزیڈنٹ ان کے جواب کو سن کر لاجواب ہو گیا اور بالآخر اپنے انگریز ساتھیوں کے ساتھ تقریب مسند نشینی میں شریک ہونے پر آمادہ ہو گیا۔

www.urduacademyts.com

تولیت (ریجنسی) کا قیام: نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کی مسند نشینی اور جانشینی کے اعلان کے ساتھ ہی سالار جنگ اور شمس الامراء پر مشتمل تولیت (ریجنسی) قائم ہوئی۔ سالار جنگ بحیثیت متولی وزیر نائب سلطنت اور شمس الامراء بحیثیت نائب حضور قرار پائے اور بعض امور پر رزیڈنٹ سے صلاح لینے کا طئے ہوا۔

تعلیم و تربیت: نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس جب چار سال کے ہوئے تو تسمیہ خوانی نہایت ہی تزک و احتشام سے منائی گئی۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس نے جب ذرا ہوش سنبھالا تو نواب مختار الملک مدار المہام وقت اور نواب شمس الامراء بہادر نے آپ کی تعلیم و تربیت کے لئے خصوصی انتظامات کئے۔ بڑی عرق ریزی کے بعد ہر علم و فن میں ماہر و جید اساتذہ اور اتالیق کا انتخاب عمل میں لایا۔ ساتھ پڑھنے اور کھیلنے کے لئے امراء و معززین کے لڑکوں کو مقرر کیا گیا۔ مولوی زمان خان، علامہ فضیلت جنگ مولوی انوار اللہ فاروقی، حافظ محمد انور، محمد اشرف وغیرہ دینیات، عربی، فارسی اور اردو تعلیم کے لئے اور کپتان کلارک انگریزی تعلیم کے لئے مامور کئے گئے۔ سر افسر الملک کی زیر نگرانی آپ کی فوجی تربیت ہوئی۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس نے جملہ علوم و فنون میں بہت جلد مہارت حاصل کر لی۔ خصوصی تعلیم و تربیت نے آپ کے جوہر اصلی کو خوب جلا بخشی اور آپ کو جامع الکمال بنا دیا۔ علوم متداولہ کے ساتھ ساتھ فن شہسواری، نشانہ بازی، شمشیر زنی، نیزہ بازی وغیرہ اور دوسرے تمام فنون سپہ گری میں نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس نے خاص عبور و مہارت حاصل کر لی تھی۔ ۱۳۰۰ھ نواب مختار الملک کا انتقال ہوا اور ۱۳۰۱ھ میں جب نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس ۱۸ سال سے زائد نہ تھے عنان سلطنت کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں میں لی۔ اس موقعہ پر بہت بڑا دربار منعقد ہوا، اس میں وائسرائے ہند لارڈ رپن نے تخت نشینی کی رسم ادا کی اور حکومت کے کامل اختیارات جو کمسنی کی وجہ سے ریجنسی استعمال کر رہی تھی نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کو حاصل ہو گئے۔ قدرت نے آپ کے توانا کندھوں پر تجربہ کا سر رکھ دیا تھا۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی رقم طراز ہیں کہ:

''نواب میر محبوب علی خان نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد سالار جنگ کے بنائے ہوئے نظم و نسق کی پوری حفاظت کی۔ سلطنت آصفیہ کی پچھلی روایتوں کی پوری پابندی کی اور شاہانہ رعب داب کے جتنے اسلوب تھے پورے کے پورے جاری کر دئے۔ اگر چہ غفران مکان بہت صغیر سنی میں تخت نشین کر دئے گئے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں پچھلے حالات کا احساس ہو سکتا ہے دربار کیسے ہونا چاہئے اور بادشاہ وقت کو کس طرح جلوس کرنا چاہئے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ باوجود اس لاعملی اور عدم مشاہدہ کے غفران مکان نے پچھلے روایتوں کو اس خوبی سے جاری کر دیا کہ گویا وہ پچھلے زمانہ سے بخوبی واقف تھے۔ شاہی رعب داب اور شاہی آداب کا اس قدر پاس و لحاظ ہوتا تھا کہ قرون وسطی کی شان آنکھوں کے سامنے پھر جاتی تھی اور مغل شہنشاہیت کا رنگ جم جاتا تھا لوگ دور دور سے یہ پر رعب شاہی دربار اور شاہی جلوس دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ حضرت غفران مکان کا شاہی رکھ رکھاؤ قرون وسطی کی تنہا یادگار تھا''

سلطنت کا نظم و نسق اور اصلاحات: نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کے عہد حکومت میں کئی اصلاحات ہوئے قدیم محکمہ جات کی نئی صورت گری کی گئی اور اور جدت اور ترقی پسندی سے کام لیتے ہوئے نئے محکمہ جات قائم کئے گئے اور طرز حکومت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے سکہ میں تبدیلی کر کے ایک جانب چار مینار کی تصویر نقش کرادی۔ ۱۸۹۰ء مطب کھولے گئے اور اسی سال پوسٹ کارڈ سلطنت آصفیہ میں جاری ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس نے قانونچہ مبارک نافذ فرمایا جس سے مدار المہام اور معین المہاموں کے اختیارات اور فرائض کی درجہ بندی اور حد بندی کی گئی تا کہ ریاست کا نظم و نسق بہتر طور پر انجام پا سکے۔ ۱۸۹۳ء میں مجلس وضع قوانین تشکیل دی گئی تا کہ سرکاری اور غیر سرکاری عہدیداروں اور اراکین باہم مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد موزوں قوانین مرتب کریں اور حاکم وقت کی منظوری کے بعد ان قوانین کو روبعمل لا سکیں۔ ۱۸۹۹ء میں اخبارات کی ترسیل کے لئے پاؤ آنہ کا ٹکٹ جاری کیا گیا اور اسی سال لاکلاس کا افتتاح عمل میں آیا۔ ۱۸۰۰ء زمانہ قحط میں لاکھوں غرباء امدادی کام پر لگائے گئے۔ رعایا کو گرانی سے محفوظ رکھنے کے لئے سات لاکھ روپے شاہی خزانے سے خرچ کئے گئے اور اسی سال سکندرآباد سے منماڑ تک ریل چلائی گئی۔

اردو زبان کی شاہی سرپرستی: عہد محبوبیہ اردو زبان و ادب کے لئے بے حد نیک فال ثابت ہوا۔ محبوب دکن آصف سادس ایک علم نواز، ادب پرور، قدر دانِ فن، نگہ بین نکتہ سنج اور مدبر شاہِ وقت تھے۔ آپ نے اپنے دور حکومت میں کئی ایک تاریخی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ان میں سے ایک اردو زبان کو سرکاری زبان قرار دینا ہے۔ ۱۳۰۱ھ بمطابق ۱۸۸۴ء یہ تاریخی و انقلابی فیصلہ اردو زبان و ادب کے حق میں ایک نوید لے کر آیا اور اردو زبان و ادب کے شاندار اور درخشاں مستقبل کا

www.urduacademyts.com

ضامن کہلایا۔ حکم شاہی کے بعد تمام دفتری اور سرکاری اور سیاسی امور کی کارروائی اردو زبان میں ہونے لگی۔ اس وقت برصغیر میں ایسی نظیر نہیں ملتی تھی۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کے عہد میں اردو زبان کی شاہی سرپرستی نے کئی باب روشن کردیئے اردو زبان کی مستحکم حالت اور روشن مستقبل کو دیکھ کر شمالی ہند کے باکمال ادباء وشعراء، اہل علم وادب نے دکن کا رخ کیا۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے اہل علم ودانش کے باہمی ربط سے اردو زبان وادب پر سودمند اثر پڑا۔ تمام اہل علم کا رجحان اصلاح اردو زبان تھا۔ یہ عظیم اور انقلابی کارنامہ صرف اور صرف نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کی ذاتی دلچسپی، علم دوستی اور اردو زبان سے محبت ولگاؤ کی بناسرانجام پایا اور یہاں سے اردو زبان وادب کو ہر محاذ پر ترقی وکامیابی پانے کا موقع ملا۔ اگر یہ کہیں تو بے جانہ ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کی راہ عہد محبوبیہ سے ہی ہموار ہوئی۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس نے برصغیر کے مشہور ومعروف اردو ادباء وشعرا کو اپنے دربار میں طلب کیا، ان کو ماہوار ومنصب جاری فرمایا تاکہ یہ ارباب کمال اردو کے خزانہ کو مالا مال کرتے جائیں۔ اس خصوص میں سب سے پہلے فصیح الملک، بلبل ہندوستان مرزا داغ دہلوی ہیں جو دربار رام پور کو خیرآباد کہہ کر نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کے دربار سے وابستہ ہوگئے اور آپ کو شاہ وقت آصف جاہ سادس کی استاذی کا شرف حاصل ہوا۔

رعایا پروری: رعایا پروری میں نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس اپنی مثال خود آپ تھے، اسی لئے وہ اپنے وقت کے ''محبوب خلائق'' اور ''محبوب دکن'' کہلائے۔ آپ اکثر راتوں کو بھیس بدل کر شہر کے گلی کوچوں میں گشت کر کے رعایا کے حقیقی حالات معلوم فرماتے۔ ضرورتمندوں اور محتاجوں ومسکینوں کی مدد فرماتے تھے۔ خود احتسابی اور اصلاح نفس کی خاطر رعایا سے سلطان وقت کا حال دریافت فرماتے اور رعایا کے آئینہ فکر وخیال میں اپنی کارکردگی کا عکس ملاحظہ فرماتے۔ اس امر کا مقصد صرف اور صرف اصلاح شاہ اور عمدہ خدمت خلق تھا۔ محبوب دکن کی اصلاحی ورعایا پروری پر محیط شب گردیوں نے کئی ایک دلچسپ افسانوں کو جنم دیا تھا۔ آپ سے منسوب کئی ایک قصے عوام کی نوک زبان پر تھے۔

یکم جنوری ۱۹۰۳ء کو جلسہ تاجپوشی قیصر ہند شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم بمقام دہلی منعقد کی گئی۔ گورنر جنرل وائسرائے نے تمام ہندو برما کے والیانِ ریاست کو مدعو کیا تھا۔ تمام والیانِ ریاست ہائے ہندو برما کے ہاتھی سونے چاندی سے مرصع زربفت کی جھولیوں سے لیس تھے۔ راجے مہاراجے ہیرے وجواہرات سے لدے ہوئے تھے۔ ان کے برعکس نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس سادہ لباس میں ملبوس تھے۔ گورنر جنرل وائسرائے نے پوچھا آپ کے ہیرے وجواہرات کہاں ہیں تو آپ نے مسکرا کر اپنے امراء واَعیانِ سلطنت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''**میرے جواہرات یہی تو ہیں**''۔

ستمبر ۱۹۰۸ء میں رود موسی کی طغیانی کسی قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔ ہزاروں افراد لقمۂ اجل ہوئے۔ ہزاروں مکان طغیانی کی نذر ہوگئے۔ بے شمار بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں۔ طغیانی کی اطلاع ملتے ہی نواب میر محبوب علی خان بہادر خود بہ نفس نفیس امدادی اور راحت کاری کے کاموں کی کمان سنبھالنے ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ متاثرین نے جب بپتا سنائی تو رعایا پرور حاکم وقت کے آنکھوں میں آنسو آگئے اور گلوگیر آواز میں فرمایا کہ ''غلام کا گھر حاضر ہے''۔ چنانچہ شاہی محلات کے دروازے سیلاب زدگان کے لئے کھول دیئے گئے۔ شہر میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے علاحدہ پانچ پانچ لنگر خانے قائم کئے گئے۔ سیلاب زدگان کے نقصان کا تخمینہ کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا اور ہر خاندان کے نقصان کی تلافی کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔

نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کا عہد زریں اپنے آپ میں بے مثال تھا۔ اسی طرح آپ کی ذات اسم بامسمہ تھی۔ وجیہ الشکل، خوب رو چہرہ، متناسب کسرتی بدن، شاہانہ انداز ومزاج اور شاہانا فیاضی، دریا دلی اور رعب ودبدبہ ہر کسی کو آپ کا محبوب بنادیتا تھا۔ آپ کے دور حکومت میں چار دربار عموماً سجا کرتے تھے: ۱۔ سالگرہ، ۲۔ عیدالفطر، ۳۔ عیدالاضحی اور ۴۔ نوروز کی خوشی کے دربار بڑے تزک واحتشام سے رات کے وقت منعقد ہوا کرتے تھے۔

فن سپہ گری: آپ سیر وتفریح کا خاصا اہتمام کرتے تھے جس کا اصل مقصد تو ریاست کی خبر گیری تھا۔ آپ کو شکار کرنا بے حد پسند تھا۔ شیر کا شکار آپ کا محبوب مشغلہ تھا۔ آپ ایک ماہر نشانہ باز تھے۔ سکہ ہوا میں اچھال کر بندوق کی گولی سے اس کا درست نشانہ کرتے تھے۔ اسی طرح فن نیزہ بازی میں انھیں کمال حاصل تھا۔ اکثر وبیشتر ایک ہی بھالے میں تین تین میخیں لے جاتے تھے اور وہ تینوں میخیں بھالے میں لگی رہتی تھیں۔ شہسواری میں بھی آپ کا کوئی جواب نہ تھا۔ شاہی اصطبل میں ایک قیمتی تنومند اور غضبناک گھوڑا تھا جو کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا۔ اپنی پیٹھ پر کسی ماہر چابک سوار کو تک بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کو بس میں کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ معروف شہسوار بھی اس سے عاجز تھے۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر نے ایک دن حکم دیا کہ سواری کے لے یہی سرکش وبدمزاج

www.urduacademyts.com

گھوڑا پیش کیا جائے۔ مصاحبین اور عمائدین سلطنت کے علاوہ مشہور شہسواروں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور اس ارادے سے باز آجائیں مگر آپ نے سب کے معروضے رد کردیئے۔ جب یہ سرکش گھوڑا آپ کی قریب لایا گیا تو آپ حسب معمول بات کرتے ہوئے اچانک ایک جست لگا کر گھوڑے پر سوار ہوگئے اور لگام ایسی کسی کہ پانچ تا چھ میل کا سفر کر کے واپس ہوئے تو گھوڑا تھک کر نڈھال ہو چکا تھا۔ اس دن کے بعد کسی نے اس گھوڑے کو سرکشی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر سانپ کاٹے کے عامل تھے' آپ کے عمل سے سانپ کا زہر اتر جاتا تھا۔ بہر کیف آپ نے اپنے فنی جوہر اور کمالات سے بڑے بڑے اہل فن و ہنر کو ششدر کر دیا تھا۔

نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس کا تخلص آصفؔ تھا آپ نے اردو میں طبع آزمائی فرمائی۔ آپ اردو کے نہایت پر گو شاعر تھے۔ آپ کو جملہ اصناف سخن پر عبور حاصل تھا۔ حضرت آصفؔ کے کلام میں زبان کی شائستگی' محاورں کی برجستگی' ندرت خیال اور فکر و فن کی بالیدگی پائی جاتی ہے۔ نواب میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ سادس آصفؔ کلام کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

غزل

انداز شوخ شوخ جو ملتے ہیں یار کے — اب ناز دیکھے کوئی دلِ بے قرار کے
وعدے کا انتظار کہاں تک کرے کوئی — ناچار ہم بھی بیٹھ رہے دل کو مار کے
افتاد اس کی کیوں نہ قیامت بپا کرے — فتنے قدم سے اٹھتے ہیں اس شہسوار کے
اس کی نشیلی آنکھوں سے ایمان کیا بچے — دشمن یہ دونوں مست ہیں پرہیزگار کے
یہ دل نہیں ہے زلف بگڑ کر جو پھر بنے — اس کو کہیں بگاڑ نہ دینا سنوار کے

آصفؔ سے ہم نے پوچھا جو مذہب تو یہ کہا
ہم ہیں غلام پنجتن و چار یار کے

ooo

حضرت آصفؔ کی غزلیات میں سلاست' روانی' برجستگی کے ساتھ ساتھ تغزل کی چاشنی اور زبان کا چٹخارہ بھی ملتا ہے:

وہ بھی کیا دن تھے ہمیں غم سے سروکار نہ تھا — دل کو ارمان نہ تھا جان کو آزار نہ تھا
جان دیتا نہ تڑپ کر یہ وہ بیمار نہ تھا — دل پہ جب ہاتھ رکھا تم نے تو آزار نہ تھا
ایلچی کو بھی کوئی قتل کیا کرتا ہے ؟ — میں خطاوار تھا قاصد تو خطاوار نہ تھا
وجہ کیا؟ کس کو قلمبند کیا آپ نے کیوں؟ — یہ روداد غمِ ہجر تھی اظہار نہ تھا
منصفی شرط ہے شیایانِ کرم غیر ہی تھے ؟ — میں ترے جور و ستم کے بھی سزاوار نہ تھا
وہ شب وصل بناوٹ سے بگڑنا اس کا — غصہ تھا قہر تھا اخلاص نہ تھا پیار نہ تھا
وور ہی سے مجھے دیکھ کے فرماتے ہیں — نہ ہوا کبھی ایسوں سے سروکار' نہ تھا

لیجئے غیر سے دو دن بھی نباہی نہ گئی
آپ کے ذہن میں آصفؔ تو وفادار نہ تھا

ooo

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

حضرت آصف نے عشقیہ موضوعات اور واردات قلبی پر مبنی غزلیات میں اپنے شعری جوہر دکھائے ہیں جس میں حسن زبان، تراکیب لفظی فصاحت و بلاغت کا عنصر ملتا ہے:

خون تک دل کا نہ چھوڑا رکھتے ہی سینہ پہ ہاتھ
واہ واہ دزدِحنا کیا ہاتھ کا چالاک تھا

ooo

فاتحہ پڑتے ہوئے اس نے سمیٹے دامن — جب میرا دستِ ہوس قبر سے باہر نکلا
مل گئیں خاک میں کیا میری وفائیں ظالم — حرفِ انکار زباں سے ترے کیوں نکلا
واہ کیا لطف ہوا وصل کی شب ان کے قریب — غیر سے وعدے کا کاغذ سرِ بستر نکلا

کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصفؔ
وہ شاہِ حسن سہی، شہر یار ہم بھی ہیں

ooo

جب اس کے کام کا نہ مرے کام کا ہے دل — پھر کس مرض کی بار خدا یا دوا ہے دل
کچھ وسعت زمین و فلک کی نہیں ساکھ — گر حوصلہ ہو دل میں تو سب سے بڑا ہے دل
انجام کیا ہو دیکھئے اس اختلاف کا — سنتا ہوں دل کی میں نہ مری مانتا ہے دل
اس سنگ دل کے جور و جفا پر خدا ہے دل — کمبخت میری جان کے پیچھے پڑا ہے دل
اکسیر کی تلاش میں کیوں خاک چھانئے — کشتہ کرے جو نقش کو پھر کیمیا ہے دل

آصفؔ کا امتحان تو کیا منصفی بھی کر
یہ ہر کسی کا حوصلہ ہر ایک کا ہے دل

ooo

محشر میں کون دوست ہو مجھ داد خواہ کا — دل اپنی راہ کا ہے، جگر اپنی راہ کا
پانی بہائے سکے، نہ زمیں جذب کر سکے — قاتل چھپے گا خون نہ مجھ بے گناہ کا
جب آئے وہ خیال میں آئے نہ خواب میں — دشوار نازکی سے ہوا پھیر راہ کا
یہ ہاتھ سے چرائے تو وہ آنکھ سے چرائے — دزدِحنا سے چور ہے بڑھ کر نگاہ کا
دیکھا یہ شعبدہ تری چشم سیاہ کا — محفل میں ہوگیا تماشاہ نگاہ کا
اک ہاتھ اور بھی، تجھے قاتل مری قسم — اک شور اٹھے چار طرف واہ واہ کا
آجائے گرم و سرد زمانہ نگاہ میں — ہنگامہ دیکھ لو جو مرے اشک و آہ کا
آصفؔ سے یہ چھٹا ہے نہ ہرگز کبھی چھٹے — لپکا ہے اس کو دید کا چسکا ہے، چاہ کا

رباعیات میں ناصحانہ اور فلسفیانہ رنگ ملتا ہے:

جو خاص میں بنتے ہیں وہ عام عوام
جو اہل دیانت ہیں جو ہیں خیر اندیش
پابند طمع ہو کے عبث ہو بدنام
ہر حال میں ہی اپنے انھیں کام سے کام

ooo

دن کے لئے واجب ہے ضیائے خورشید
یہ لازم و ملزوم ہمیشہ سے ہے
لازم ہے کہ پانی ہو زراعت کو مفید
آقا سے ملازم کی برائے امید

www.urduacademyts.com

حضرت آصفؔ نے مختلف موضوعات پر کئی ایک عمدہ نظمیں لکھیں۔ آپ کے پاس موضوعات کا تنوع ملتا ہے:

اطاعت:

طاعت کے بعد جو ہے اطاعت کا پائے بند — دنیا و دیں میں وہ نہ کبھی، ہوگا شرمسار
ماتحت مانے حاکمِ اعلیٰ کے حکم کو — یوں اہل روزگار کی ہو طرز روزگار
مالک سے کام رکھے، نہ رکھے کسی سے کام — اوس کا اسی میں نفع اسی میں ہے افتخار
لغزش نہ ہو وگرنہ گرے گا وہ سر کے بل — تھامے رہے عنانِ اطاعت کو استوار
اس کو بھی ہو یقین عنایت اسی طرح — سرکار کو ہے جیسے سپاہی کا اعتبار

خطاب بہ افواج:

ایے جاں نثار فوج ظفر موج لشکر ہے — جوہر ہیں تم میں صورت شمشیر آبدار
رخ رخ سے مرد مرد کے مردانگی عیاں — رگ رگ سے فرد فرد کے جرأت ہے آشکار
ایسے سپاہیوں کی سپاہی کو قدر ہے — تعریف کیوں نہ آئے مرے لب پہ باربار
فن سپہ گری مری میراث جد کی ہے — اس سے ہی میرا نام ہے اس سے ہی افتخار

اصلاحِ فوج:

رہیں ساز و ساماں سے اپنے دوست — جو ہو تیغ بجلی، تو گھوڑا پری
کرے عشق اس فن کی جس فن میں ہو — یہی آدمی کی ہے دانش وری
ہنرور سے ہے سلطنت کا نمود — ہنر ہی سے ہوتی ہے نام آوری
بنایا حکیموں نے تھا آئینہ — ہوی شہرت صنع اسکندری
جو ہونگے قواعد میں چالاک و چست — تو پھر کیا نہ ہوگی ہنر پروری
تمہاری طرف سے وفاداریاں — ہماری طرف سے کرم گستری
دعا یہ ہے آصفؔ کی اس فوج پر — رہے سایہء دامن حیدری

طلباء سے خطاب:

علم کی قدر کرو، قدر کرو، قدر کرو — تم کو اللہ نے بخشی ہے اگر طبع سلیم
سمجھو سمجھو وہ نکات اور وہ اسرار و رموز — دیکھو دیکھو وہ کتب جو ہیں جدید اور قدیم
علم ہے اس کی دوا اور دوا بھی اکسیر — کہ جہالت بھی ہے منجملۂ امراضِ مقیم
طالب علم ذکی اور ہواستاد شفیق — کیوں پسندیدہ نہ ہو ایسی تعلم تعلیم
فہم و دانش کی ترقی کا یہی باعث ہے — علم کی وجہ سے تھی حضرتِ لقمان بھی حکیم
قابل صحبتِ شاہاں و سلاطیں ہے وہی — عزت اس کی ہے جو کہلائے زمانہ میں فہیم
دیں دنیا میں جو پھیلی تو اسی کی خوشبو — مشک اذفیر کی تہ عنبر سارا شمیم
ایسی دولت کے لیے کوشش و محنت ہے ضرور — گرچہ تقدیر عطاء جس کو کرے ربّ کریم
یہ جو آصفؔ نے کہا غور سے اس کو سمجھو — علم وہ شئی ہے کہ اللہ کا نام علیم

www.urduacademyts.com

اعلیٰ حضرت آصفؔ کو تقریر و تحریر پر یکساں عبور حاصل تھا۔ آپ کی تقاریر مخاطب کے عین تقاضوں کے مطابق ہوا کرتی تھیں۔ تقاریر کا نفسِ مضمون اور روح مضمون، بیدار مغز، ذہن کشا اور واضح ہوا کرتا تھا جس سے آپ کی زبان و بیان کی لسانی خوبیاں بھرپور طور پر عیاں ہیں:

میرے عزیز طلباء!

''تمہارا ایڈریس لینے میں مجھے ایک خاص قسم کی خوشی حاصل ہوئی کیونکہ تمہاری ترقی، علم و فضل میں مقابل دیگر امور کے مجھے زیادہ دلچسپی ہے۔ میں تم کو گلشن ریاست کے ہونہار پودے سمجھتا ہوں اور جس طرح ہر باغبان اپنے باغ کے بڑے اشجار کی حفاظت سے زیادہ چھوٹے درختوں کی نشو و نما کی نگرانی کرتا ہے۔ اسی طرح میری توجہ اپنے نونہال نوخیز طالب العلم رعایا کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ تمہاری ترقی، علم اور تہذیب و اخلاق سے میرے ملک کیلئے بہت کچھ فائدہ کی امید کی جاتی سکتی ہے اور یقیناً تم میں سے اکثر ایسے ہیں جو آٹھ سال کے بعد اس ریاست کے لئیق و کارگزار عہدہ دار خیرخواہ و وفادار رعایا ہوں گے۔ پس اس وقت تمہاری تعلیم میں جس قدر کوشش کی جائے اس کا عمدہ اثر نہ صرف تمہاری ذات پر منحصر رہے گا بلکہ اس سے تجاوز کر کے تمہارے ذریعے سے ملک کی عام بہبودی و ترقی کو مستحکم کرے گا۔ پس تمہارے لئے یہی وقت ہے کہ تم اپنی آئندہ بہبودی کا سرمایہ جس قدر جلد ہو سکے جدوجہد کے ساتھ حاصل کرلو'

وفات حسرت آیات: محبوب خلائق، محبوب دکن، اعلیٰ حضرت آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خان بہادر غفران مکان آصفؔ ۴ رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ م ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ ایک افسانوی، مخلص و مشفق رعایا پرور بادشاہ، اور دلیر و شجیع حاکم سلطنت آصفیہ اور مدبر و منصف سلطان وقت اپنے پیچھے اپنی فیاضی، علم نوازی، داد شجاعت کی ایک طویل داستان چھوڑ گیا۔ آپ کے جسد خاکی کو تاریخی مکہ مسجد کے صحن میں آسودہ خاک کیا گیا۔ آج بھی آپ کا مزار مرجع خلائق ہے۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

☆☆☆

استفادہ کتب و ماخذ:

☆ جریدہ غیر معمولی سرکار عالی' ۲۳ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ
☆ تزک محبوبیہ جلد اول' از: غلام صمدانی گوہرؔ ۱۳۱۹ھ
☆ دربار آصف' از: غلام صمدانی گوہرؔ
☆ ارسطو جاہ' از: پروفیسر عبدالمجید صدیقی
☆ محبوب الکلام (رسالہ وگلدستہ) حسب الحکم مدار المہام سرکار عالی شاؔذ یقعدہ ۱۳۲۳ھ
☆ مرقع سخن' جلد دوم از ڈاکٹر سید شاہ محی الدین قادری زورؔ ۱۹۳۷ء
☆ مملکتِ آصفیہ ناشر ڈاکٹر محمد عبدالحی' ۳۰ جون ۱۹۸۶ء
☆ دکن میں اردو' از: نصیر الدین ہاشمی' جولائی ۲۰۰۲ء
☆ مملکت آصفیہ میں اردو زبان کی ترویج و ترقی' از نظام ٹرسٹ ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ
ایس.اے' ای.آر.پی' محکمہ تعلیمات' تلنگانہ سرکار'
آلہ گفتن : 09705853523

www.urduacademyts.com

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری اور ان کی فکری اساس

خواجہ حیدر علی آتش کی پیدائش 1778ء میں فیض آباد میں ہوئی۔ ان کے گھر والوں نے ان کا نام خواجہ حیدر علی رکھا اور ان کے والد کا نام خواجہ علی بخش بتایا جاتا ہے۔ آتش کا سلسلہ نسب خواجہ عبداللہ احرار تک پہنچتا ہے جو بغداد کے مشہور صوفی اور نقشبندیہ سلسلہ کے ایک خاص رکن تھے۔ ان کے اجداد تلاش معاش میں ترک وطن کر کے ہندوستان تشریف لائے اور یہاں انھوں نے دہلی میں پرانے قلعے کے قریب سکونت اختیار کی۔ دہلی کے انتشاری اور افراتفری ماحول کو دیکھتے ہوئے آتش کے والد خواجہ علی بخش نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد چلے آئے۔ انھوں نے ایک خاص علاقہ میں سکونت اختیار کی تھی جسے مغل پورہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ انہوں نے صوفیانہ مزاج ہونے کے سبب فیض آباد آ کر پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا اور اسی پر اوقات بسر کرنے لگے۔ گویا اس سلسلہ طریقت نے جہاں ان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کیا وہیں تزکیۂ نفس کا بھی سامان فراہم کیا۔ یہیں پر آتش کی پیدائش ہوئی۔ آتش ابھی کم سن تھے یعنی پوری طرح جوان نہ ہو پائے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور کسی سرپرست کے نہ ہونے کی بنا پر وہ اپنی تعلیم کو مکمل نہ کر سکے۔ صحیح رہبری نہ ہونے کی وجہ سے بانکوں اور سپاہی پیشہ لوگوں کی صحبت میں رہنے لگے اور خاص طور پر شمشیر زنی میں اچھی مہارت پیدا کر لی۔ تھوڑی تھوڑی باتوں پر تلوار کھینچ لیتے۔ بقول عبدالرؤف عشرت جلد ہی ''تلواریے'' مشہور ہو گئے۔

آتش نے اپنی ذاتی کوششوں سے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا' مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ شروع میں وہ اردو کے بجائے وہ فارسی میں شعر کہنے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ ان کی شعر گوئی اور سپہ گری نے فیض آباد میں نواب محمد تقی خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا جو فیض آباد کے ایک معروف و مشہور رئیس تھے۔ خود بھی شاعری کرتے تھے اور شاعروں ادیبوں اور ہنرمندوں کی قدر اور سرپرستی بھی کرتے تھے۔ انھوں نے آتش کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا اور اپنے یہاں ملازمت دے دی۔ جب نواب غازی الدین حیدر کے زمانے میں نواب محمد تقی خان فیض آباد سے ہجرت کی آتش بھی ان کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ اس وقت لکھنؤ میں شعر و شاعری کا بڑا چلن تھا گلی گلی میں مشاعرے ہوتے تھے۔ شاعروں کی ٹولیاں تھیں اور گروہ بندیاں بھی خوب تھیں۔ دہلی سے نئے نئے آئے ہوئے شاعر حضرات لکھنؤ کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنا ایک نیا رنگ دیکھا رہے تھے۔ دربار کی سرپرستی میں انشاؔ اور مصحفیؔ کی آپسی نوک جھوک عروج پر تھی۔ ان دنوں لکھنؤ میں جرأتؔ کا بھی طوطی بول رہا تھا۔

آتشؔ کو مصحفیؔ کا انداز پسند آیا۔ وہ اُن کی زبان دانی سے متاثر تھے' اسی لیے ان کی شاگردی اختیار کی۔ دونوں کی

www.urduacademyts.com

طبیعتوں میں بہت زیادہ یکسانیت پائی جاتی ہے۔ مصحفی کی طبیعت میں شاہ نیازی بریلوی اور دوسرے بزرگوں کی صحبت نے جو گداز اور متانت پیدا کردی تھی وہ ان کے کلام کا خاصہ ہے۔آتش کا خاندان بھی خواجہ زادوں کا خاندان تھا۔پیری مریدی اور فقیری کا عنصر ان کے یہاں بھی ملتا تھا۔اسی لیے آتش کو مصحفی کی شخصیت اور شاعری نے متاثر کیا۔ مصحفی کی شاگردی اور لکھنؤ کی شعری و علمی صحبتوں اور محفلوں نے رفتہ رفتہ انھیں متاثر کیا اور مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور دن رات علمی مباحث میں مصروف رہنے لگے۔ مصحفی نے بھی ہونہار شاگرد کی حوصلہ افزائی و پزیرائی کی۔آتش کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی کی اگر عمر نے وفا کی اور ان کا یہی وتیرہ رہا تو آتش یکتائے زمانہ ہوں گے۔اور حقیقتاً آگے چل کر ایسا ہی ہوا۔انھوں نے شوق مطالعہ کی بنا پر امتیاز پیدا کیا۔خواجہ حیدر علی آتش کافی ذہین اور فی البدیہہ شعر کہنے کی صلاحیت اور لیاقت رکھتے تھے۔آتش کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔انھوں نے اردو فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی مگر ان کا فارسی کا کلام کہیں دستیاب نہیں ہے۔البتہ تذکروں میں ملتا ہے کہ ابتدا میں وہ اردو شاعری سے زیادہ فارسی کی طرف زیادہ مائل تھے لیکن جب اردو کی طرف آئے تو ایسے آئے کہ پھر فارسی کو بالکل ترک کردیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تعلیم ادھوری رہ جانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کم علم تھے۔ وہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے مگر اپنے طور پر مطالعہ کرتے رہے اور اپنی علمی استعداد بڑھاتے رہے۔عربی پڑھی مگر فارسی سے زیادہ دلچسپی رہی۔اپنے کلام میں علم نجوم، فن خطاطی کی اصطلاحوں وغیرہ کے استعمال سے اندازہ لگتا ہے کہ وہ ان علوم سے آگاہ تھے جو اس زمانے میں رائج تھے۔خود اعتمادی ان کے یہاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ان کا یہ شعر اس بات کی غمازی کرتا ہے:

سالہا سال سے تحصیل سخن ہے آتش
اس قلم رو میں ہے مدت سے اجارا اپنا

آتش لکھنؤ کے فرنگی محل کے علمی و ادبی حلقے سے بھی فیض یاب ہوئے۔یہی وہ زمانہ تھا جب بادشاہ وقت کی جانب سے آتش کو 80 روپے ماہانہ ملنے لگے۔ان کا یہی ذریعہ معاش تھا۔لکھنؤ میں آنے کے کچھ ہی وقت بعد نواب محمد تقی خان کا انتقال ہوگیا۔ان کے انتقال کے بعد آتش نے اب کسی اور کی ملازمت کرنا پسند نہیں کیا جو رقم بادشاہ وقت سے ملتی تھی کچھ گھر میں دیتے باقی غرباء اور ضرورت مندوں کو کھلا پلا کر مہینے سے پہلے اس سے چھٹکارا حاصل کرلیتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آتش 80 روپے میں 15 روپے گھر میں دیتے' باقی اللہ کی راہ میں خرچ کردیتے تھے۔مولانا حسین آزاد نے لکھا ہے کہ اسی وجہ سے مہینے میں ایک آدھ دن فاقہ بھی ہوجاتا تھا۔وہ آزاد طبع اور حسن پرست آدمی تھے۔ سپاہیانہ لباس پہنتے تھے اور ہر وقت تلوار لٹکائے رکھتے تھے مگر قناعت اور توکل ان کی خاص صفت تھی۔انھوں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔کچھ ان کے شاگردوں میں لکھنؤ کے امیرزادے بھی تھے جو ان کو کچھ دینا چاہتے تھے لیکن بہ مشکل ہی کسی سے کچھ قبول کرتے۔بعض نے لکھا ہے کہ نورگنج کے پاس

www.urduacademyts.com

ایک چھوٹا سا مکان اور باغیچہ بنالیا تھا مگر مولانا حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس میں چھت اور کچھ چھپر سایہ تھا' بوریا بچھا ہوا تھا' اسی پر لنگی باندھے صبر وقناعت سے بیٹھے رہتے تھے اور اپنی چند روزہ زندگی کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز و بے پرواہ فقیر تکیہ پر ٹیک لگائے بیٹھا ہو۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود آتش کی طبیعت میں بانکپن تھا۔ وہ ہمیشہ وضع قطع کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ایک ڈنڈا ہمیشہ ہاتھ میں رہتا تھا۔ گیرورنگ کا تہبند باندھتے تھے اور پیر میں سلیم شاہی جوتا پہنتے تھے۔ آتش کو اپنی زندگی میں دولت، شہرت اور ثروت کی ہوس کبھی نہیں رہی۔ زندگی بھر کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے اور نہ ہی کسی کا قصیدہ لکھ کر منفعت حاصل کی اور نہ ہی کسی کی ہجو لکھی۔ بے نیازی کا یہ عالم تھا بادشاہ نے کئی بار بلوایا مگر یہ نہیں گئے۔ خواجہ حیدر علی آتش نے اپنی زندگی سادگی اور قناعت پسندی میں بسر کردی۔ وہ بڑے خوددار اور خدا ترس انسان تھے۔ ان کو دربار سیاست اور شہر کے ہنگاموں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا مگر پھر بھی شہر کے امراء غریب، شاعر اور سخن فہم ان کو بے حد قدر منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

آتش اور ناسخ میں ہمیشہ معاصرانہ چشمک رہتی تھی لیکن ناسخ کبھی بھی سطحی باتیں یا گھٹیا پن پر نہیں اترے جس کا نظارہ لکھنؤ والے مصحفی اور انشاء کے معاملے میں دیکھ چکے تھے۔ دراصل دونوں کے شاعرانہ انداز ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے بلکہ ناسخ کے انتقال کی خبر نے آتش کو بہت رنجیدہ کیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ کسی بھی تذکرہ نگاروں نے خواجہ حیدر علی آتش کی اہلیہ کا نام اور ان کے خاندانی حسب ونسب کے بارے میں کچھ لکھا نہیں ہے۔ لہذا صرف شریف خاندان اور کفایت شعاری کے بیان سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ خاتون آتش کے مزاج سے واقفیت رکھنے والی، ان کا حکم بجالانے والی اور ان کی غم گساری کرنے والی رہی ہوں گی کچھ دنوں کے بعد ان کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام والدین نے خواجہ محمد علی رکھا تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کے ساتھ رہ کر وہ بھی شاعر ہوئے جوش تخلص اختیار کیا۔ لیکن اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملیں۔ حتی کہ آتش کے شاگردوں کی فہرست میں ان کا نام نہیں ملتا۔ حکیم عبدالحئ نے لکھا ہے کہ ایک بیٹا محمد علی نام جوش تخلص بڑھاپے میں وہی عصائے پیری تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد آتش کی آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ مذہباً اثنا عشری ہونے کے باوجود آزاد خیال تھے۔ ہندو مسلم سب سے خلوص سے پیش آتے تھے۔ بڑھاپے میں داڑھی بڑھالی تھی اور اس پر مہندی بھی لگاتے تھے۔ بھنگ پینے کا چسکا تھا اور حقہ سامنے رہتا تھا۔ اس باکمال شاعر نے لکھنؤ ہی میں 1847 میں وفات پائی۔ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ وہ ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے' یکا یک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلے کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز وتکفین کے بعد جسد خاکی کو انھیں کے مکان میں دفن کردیا۔

خواجہ حیدر علی آتش کے صاحب زادے خواجہ محمد علی جوش کو اپنے والد سے اس قدر لگاؤ تھا کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی جدائی کا صدمہ انھیں اندر ہی اندر کھانے لگا، اپنی

www.urduacademyts.com

زندگی بالکل بے کیف اور خالی خالی معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت گم صم رہنے لگے یہاں تک کہ مشاعروں کی محفلوں اور مجلسوں میں بھی جانا بند کر دیا باپ کی وفات کے ایک دو سال بعد خود اللہ کو پیارے ہو گئے۔

خواجہ حیدر علی آتش ایسی تہذیب کے پروردہ تھے جو روز بروز زوال کی طرف جارہی تھی اور قدریں پاس پاس ہورہی تھیں۔اس تہذیب کا ظاہر اور باطن یکساں نہیں تھا بلکہ اس پر ملمع کاری تھی دیکھاوا تھا، سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس کا مستقبل کیا ہوگا، اس سے نباہ کیے جارہے تھے۔آتش کے شاگردوں، دوست احباب اور ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور سبھی لوگ ان کی شخصیت اور شاعری کے دلدادہ تھے۔آتش کے کلام کا مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہو چکا تھا۔ دوسرا ان کی وفات کے بعد مرتب ہوا۔ان کی شخصیت اور شعری وقار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے شاگردوں کی تعداد 70 سے زائد ہے۔اس میں کچھ ایسے شاگرد بھی تھے جن کی حیثیت مسلم الثبوت اساتذہ کی تھی مثلاً پنڈت دیا شنکر نسیم، نواب مرزا شوق اور نواب سید محمد خان وغیرہ۔

اورنگ زیب عالم گیر کی موت کے بعد مغل حکومت دن بدن تنزل کا شکار ہوتی جارہی تھی۔وہ لوگ اپنے تخت کے لیے خود آپس میں لڑنے لگے تھے۔ان نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مرکز مزید کمزور ہونے لگا۔باقی کسر مرہٹوں، جاٹوں، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کردی۔گویا دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔کچھ اہل و علم و فضل دہلی کی گلی اور کوچوں کو چھوڑ کر لکھنؤ پہنچے۔دہلی کی طرح لکھنؤ بھی اردو شعر و ادب کا مرکز بن گیا۔دربار کی سرپرستی نے شاعری کا ایک عام ماحول پیدا کر دیا جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا چلن اتنا عام ہوا کہ جابجا مشاعرے ہونے لگے۔امراء، رؤسا اور عوام سب مشاعرے کے دیوانے تھے۔اردو شاعری میں لکھنؤ کا رنگ جھلکنے کی وجہ سے ان کی انفرادیت قائم ہوئی۔یہ تبدیلی زیادہ تر بیان کرنے کے انداز صنعتوں کے استعمال اور خیالات و جذبات کے انتخاب میں نمایاں ہوئی۔لکھنؤ کی شاعری میں تین چیزوں کی طرف خاص توجہ دی گئی غزل، مرثیہ اور مثنوی۔جن شاعروں کی وجہ سے دبستان لکھنؤ کا وقار اور اعتبار قائم ہوا ان میں ایک اہم نام خواجہ حیدر علی آتش کا ہے جنھوں نے زبان کی صحت و صفائی اور اس کو لطیف، نازک، خوبصورت اور دلکش بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان کا پورا کلام زبان کی مرصع سازی اور بندش الفاظ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ آتش کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت زبان کی صفائی اور محاورات کا فنکارانہ استعمال ہے۔الفاظ اور تراکیب کی بندش سے شعروں میں حسن پیدا کر دیتے ہیں مثلاً انھیں کا ایک شعر ہے:

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آتش کے خیال میں شاعری ایک فن ہے جس میں لفظوں کا اچھے سے اچھا استعمال ہونا چاہیے۔اس لیے ان کے یہاں فن کے ساتھ ساتھ جذبات بھی اس طرح شامل ہیں کہ

www.urduacademyts.com

انھیں جدا نہیں کیا جاسکتا۔اور آتش کا احساس بھی جمالیات سے بھرا ہوا ہے۔ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ زبان کی فنی نزاکتوں سے واقفیت تھی۔ لہذا الفاظ کا صحیح ،برجستہ استعمال آتش کی بدولت منظر عام پر آکر جسے قبولیت کی سند حاصل ہوئی۔انھیں خصوصیات کی بناپران کی شاعری اپنے زمانے کی شاعری نہ ہوکر بلکہ ہرعہد کی شاعری قرار پائی۔

آتش عظیم المرتبت غزل گوشاعر تھے ان کے مزاج میں قلندرانہ شان تھی خاندانی پس منظر کی وجہ سے انھوں نے دنیا کو کبھی بھی مزرع آخرت سے بڑھ کر اہمیت نہیں دی۔ان کی شاعری میں تصوف کی گہری چھاپ ہے۔نفس کشی اور مسلسل ریاضت نے انھیں صوفی اور بوریانشیں شاعر بنادیا۔ آتش کے کلام میں تصوف کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔تصوف واخلاق سے متعلق آتش کی شاعری لکھنؤ اسکول کی آبرو رکھنے کے لیے کافی ہے۔اس عہد میں لکھنؤ کی شاعری میں تصوف بہت کم نظر آتا ہے لیکن پھر بھی آتش نے اپنی شاعری میں تصوف کا چراغ روشن کر کے وہ معنویت پیدا کردی اوراپنے کلام کو پرسوز اور پر اثر بنادیا ہے۔آتش کا تصوف ان کی شخصیت کا ترجمان اوران کے مزاج کی آن بان رکھتا ہے۔اور صرف لکھنؤ ہی میں ان کے امتیاز کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ پوری اردو شاعری میں محور کن جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:

عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے
ہوائے گل سے ہم کس وادی پرخار میں آئے

معرفت میں تیری ذات پاک کے
اڑتے ہیں ہوش و حواس ادراک کے
ظہور آدم خاکی سے یہ ہم کو یقیں آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے خلوت نشیں آیا

آتش اپنی شاعری سے انسانی عظمت کو اجاگر کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں اور وہیں پست ہمتی کی مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے مختلف شعروں میں دنیا کی فنا پذیری، دنیا کی دولت، جاہ وحشمت سے کنارہ کشی، دنیا کو ترک کرنا، اللہ پر بھروسہ رکھنا، معرفت اور قناعت جیسے اچھوتے موضوعات ان کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

آتش کی شاعری میں رنگ ناسخ کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔مگر وہ مضمون کی طرف سے غفلت نہیں برتے۔ ان کے دیوان میں بہت سے اشعار ایسے ملتے ہیں جوان کی بلندخیالی کی گواہی دیتے ہیں۔ان کے اشعار جذبات و احساسات سے خالی نہیں ہیں۔ان کے مزاج میں جو بانکپن اور بے نیازی ہے وہ ان کے اشعار میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔عام شعرا کی طرح آتش کی شاعری میں بھی حسن وعشق دکھائی دیتا ہے۔ناز و نیاز ،ہجر، وصال ،خواہش دید اور تمنائے وصال جیسے موضوعات ان کی شاعری میں کثرت سے ملتے ہیں لیکن ان کا نقطہ نظر یہاں بھی سب سے الگ تھلگ ہے۔ان کے کلام میں دہلی کے شعراء جیسا افلاطونی عشق یا لکھنوئی شعراء کی ہوسنا کی اور جنسیت زدگی نہیں ہے۔عشق سے متعلق وہ بہت صحت مند اور مثبت نظریہ رکھتے ہیں۔ان کا محبوب کوئی

www.urduacademyts.com

مافوق الفطرت مخلوق نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک انسان ہوتا ہے جو سماج میں رہتا ہے، جس کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے۔ دنیا کے نشیب وفراز کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے عشق میں سماجی پابندیاں بھی ہیں اور مذہبی رکاوٹیں بھی۔ آتش کی عشقیہ شاعری میں اسی وجہ سے بڑی گرمی، حرارت اور فطری پن ہے۔ انھوں نے بعض ایسے سوالات بھی قائم کیے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کو معاشرے پر تنقید وتبصرہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ بعض لوگ آتش کو اردو کا حافظ بھی کہتے ہیں ان کے یہاں مستی اور سرود وکیف کی جولہریں ملتی ہیں وہ انھیں حافظ کے مدمقابل کھڑا کرتی ہے۔

جہان وکارِ جہاں سے ہوں بے خبر مست
زمیں کدھر ہے کہاں آسماں نہیں معلوم

خواجہ حیدر علی آتش کی شاعری کے مختلف ایسے رنگ ہیں جہاں انھوں نے لکھنوی شعراء کے انداز سے ہٹ کر طبع آزمائی کی ہے۔ درحقیقت یہی آتش کے کلام کی انفرادیت ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری کو تنگ دائرے سے نکالنے اور فارسی کی تقلید سے آزاد کرانے میں آتش نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ جو لوگ ان کی شاعری کو فارسی کی نقالی کہتے ہیں انھیں ان کی عشقیہ شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حسن وعشق آتش کی شاعری کا امتیاز ہے۔ آتش کی شاعری میں حسن وعشق دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں بالکل اسی طرح سے جیسے جسم وروح ایک ساتھ ہیں گویا حسن جسم ہے اور عشق روح ان دونوں کے ملنے سے آتش کے یہاں جسم کا بیان اتنے والہانہ وفطری انداز سے شاعری میں آیا ہے کہ اس میں رقص وسرشاری کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً یہ شعر دیکھیے ایک مطلع اور ایک مقطع:

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا
بغل میں صنم تھا، خدا مہرباں تھا
بیان خواب کی طرح جو کررہا تھا
یہ قصہ ہے جب کا، کہ آتش جواں تھا

یہاں جسم وروح، حسن وعشق وصل احساس جمال کے ساتھ مل کر ایک ہوگئے ہیں۔ یہ ایسے امتزاج ہیں جو ہمیں صرف آتش کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انھوں نے عام ترکیبوں کے علاوہ اظہار خیال کے لیے تشبیہات اور استعارات سے بھی اپنے کلام میں حسن کا جادو جگایا ہے اور رمزوکنایہ میں بھی شاعری کی ہے۔ زندگی کی گوناگوں کیفیتوں اور حالتوں کو ظاہر کرنے کے لیے بہت ساری علامتوں کا بھی سہارا لیا ہے۔ ان علامتوں میں بہت سی علامتیں ایسی ہیں جو آتش نے خود اختراع کی ہیں اور کچھ روایتی علامتیں ہیں جن کو انھوں نے نیا انداز عطا کیا ہے۔ ان کی تشبیہیں صاف سادہ اور لطف آمیز ہوتی ہیں پیچیدگی ومعاملہ بندی نام کو نہیں ہوتی۔ یہ شعر دیکھیے:

جسم خاکی کے تلے جسم مثالی بھی ہے
اک قبا اور بھی ہم زیر قبا رکھتے ہیں
نگاہ یار کو پھرتے ہی ہم سے اے آتش
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی

www.urduacademyts.com

آتش اپنی شاعری میں ظاہری حسن عطا کرنے کے لیے خیالی اور روایتی تشبیہات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ عام مشاہدات سے اپنی تشبیہات کو وہ خود وضع کرتے ہیں اور جانے پہچانے مناظر کو شاعری میں برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔آتش کی شاعری زندگی کے شعور سے جڑی ہوئی ہے وہ اپنے تجربوں اور مشاہدات کو شعری پیکر میں ڈھالتے ہیں اور اسی لیے عام مسائل حیات بھی ان کی شاعری میں دیکھی جاسکتی ہے۔

آتش کے کلام کا بیشتر حصہ رجائیت اور زندگی کی قوت سے لبریز ہے۔ان کی تصور زندگی مکمل طور پر عشرت اور انبساط کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ان کے یہاں غم، ماتم، درد کا ذکر بہت تھوڑا ہے۔وہ ہمیں زندگی سے بے زاری اور مایوسی نہیں سیکھاتے بلکہ ان کے یہاں ان سب چیزوں سے مقابلہ کرنا سیکھاتے ہیں ۔ان کی شاعری میں رندی ،مستی اور رنگینی کی لہریں جیسی کیفیات ملتی ہیں۔انھوں نے غزل کی عام تشبیہات اور پامال استعاروں سے ہٹ کر براہ راست تغزل کا جادو جگایا ہے۔آتش کی شاعری اپنی مخصوص لب ولہجہ اور انفرادی انداز بیان کی وجہ سے صاف طور پر پہچانی جاتی ہے۔ہر شعر سے آتش کی انفرادیت جھلکتی ہے:

سن تو سہی جہاں میں تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
بت خانہ کھود ڈالیے، مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

آتش کی شاعری صرف خدوخال کی شاعری نہیں ہے انھوں نے جذبات اور احساسات کو نہایت موثر اور دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں اور نئے نئے مضامین باندھتے ہیں ان کے خیالات میں بلندی پائی جاتی ہے مثال کے طور پر:

مرا دیوان ہے اے آتش خزانہ
ہر ایک بہت اس میں ہے گنج معانی

آتش نے ناسخ کی اصلاح زبان کی تحریک کے الزامات کو بھی قبول کیا لیکن انھوں نے ایسی زبان اختیار کی جسے لوگوں میں قبول عام کا درجہ حاصل ہوا۔ انھوں نے قوت تخیل کے زور سے اشعار میں ایسی رنگارنگی، دلکشی اور رعنائی پیدا کی جو پڑھنے والوں کے ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ آتش کی شاعری کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں کے مطلع سے ہی ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔اور مطلعوں میں پوری فضا قائم ہوجاتی ہے پھر وہی فضا پوری غزل میں رنگ بھرتی ہے۔ آتش نے ردیفوں کو بھی طرز ادا سے ملا کر اس طرح استعمال کیا ہے کہ شعر کے لہجے میں حسن و شائستگی پیدا ہوجاتی ہے ،قافیہ اور ردیف ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں ۔ردیفوں اور قافیوں کے استعمال میں بھی ان کا جمالیاتی شعور بہت نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔آتش کے یہاں ایک سحر آفرینی مصوری، موسیقیت ،نغمگی پیدا ہوگئی ہے جس سے ان کے فن کی لے نشاطیہ

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

اور تمنا خیز فکر کی لے سے بہت ہم آہنگ ہوگئی ہے۔ان کے بہت سے اشعار میں معنٰی آفرینی اور تہہ داری ملتی ہے۔

آتش نے اپنے مفکرانہ احساسات سے کام لیا اور اپنی غزلوں میں نئی فکر اور ذہنی جہات پیدا کیں۔ان کے یہاں جو بھی موضوع ہوتا ہے ان تمام میں فکر کی جودت اور ندرت نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

آتش کا اسلوب نہایت بے تکلف، بے ساختہ اور برجستگی لیے ہوئے ہوتا ہے یہ ان کے غزل کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر اشعار ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کے اکثر مصرعے زبان زد ہوکر عوام میں مشہور ہو چکے ہیں:

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ گور سکندر ہے نہ قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

ooo

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرہ خون نہ نکلا

ooo

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر کیا شرح آرزو کرتے

یہ وہ اشعار ہیں جن سے انسان ہر عہد میں متاثر ہوا ہے۔مولانا عبدالسلام ندوی نے تذکرہ شعرالہند میں آتش کے فنی محاسن کو سراہتے ہوئے شیخ ناسخ کے مقابلے میں انھیں ترجیح دی اور ان کے کلام کی خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔

آتش کے کلام میں چند خامیاں بھی ہیں جس کو لکھنؤی شاعری کی فنی اور غیر صحت مند شعری قدروں کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔یہ کلام ان کے سنجیدہ لمحوں کی تخلیق نہیں اس کو آتش نے اپنی استادی کا سکہ جمانے اور ناسخ کی سنگلاخ زمینوں میں لکھی غزلوں کے جواب میں تخلیق کیا ہے۔لیکن ان کے اسی شعری حصے کو سامنے رکھ کر ان کی پوری شاعری کو تنقید کا نشانہ بنانا مناسب نہیں۔

اس کے باوجود خواجہ حیدر علی آتش کی اہمیت کا اندازہ ہم اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ انھوں نے غزل کو اپنے عہد کے تقاضوں سے ہم کنار کیا۔فکری اور صوفیانہ عناصر سے کام لیتے ہوئے غزل کو ایک وقار بخشا۔آتش نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اردو شاعری میں بڑا نام کمایا اور اپنے عہد کو بے حد متاثر کیا وہ دبستان لکھنؤ کے صف اول کے غزل گو شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد اکبر
اسسٹنٹ پروفیسر (سی پی ڈی یو ایم ٹی)
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
موبائل : 8373984391

www.urduacademyts.com

ملک الشعرا خاقانی ہند، خان بہادر شیخ ابراہیم ذوقؔ دہلوی مرحوم

۱۲۰۴ھ میں ایک غریب خاندان کے سپاہی کے گھر جن کا نام شیخ محمد رمضان تھا، پیدا ہوئے جو کہ دہلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے، اور نواب لطف علی خاں نے اُنھیں معتبر اور لئیق آدمی سمجھ کر اپنے حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے، شیخ مرحوم اُنھیں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ شیخ محمد رمضان اگرچہ ایک غریب سپاہی تھے لیکن تجربہ اور نیک و قابل لوگوں کی صحبت نے اُنھیں ایسا باخبر کر دیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں تاریخ کی قیمتی سرمایہ شمار کی جاتی تھیں۔ ایسی صورتوں میں کس کو علم تھا کہ اس رمضان میں اُفق آسمان پر وہ چاند نمودار ہوگا جو دنیا کے آسمان سخن کا ہلال عید ہوگا۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو پہلے حافظ غلام رسول صاحب شوقؔ کے پاس پڑھنے کے لئے جانے لگے، اور حافظ جی کی صحبت سے ہی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ دل کو ایک عجیب روحانی لذت اس سے حاصل ہونے لگی۔ چونکہ قدرت نے ازل ہی سے مادہ سخن گوئی اور سخن فہمی کا رکھا تھا، لہذا تھوڑے ہی زمانے میں شعر و شاعری میں برق دم ہوگئے اور اپنے استاد شیخ غلام رسول شوقؔ سے اصلاح بھی لینے لگے۔ اسی محلّہ میں ایک صاحب میر کاظم حسین بیقرارؔ بھی رہتے تھے جو ہم سبق تھے اور وہ بھی شعر کہہ کر حافظ صاحب مذکور سے ہی اصلاح لیتے تھے۔ شیخ صاحب کی جودب طبع نے میر کاظم حسین بیقرارؔ ہی کر کے چھوڑا، کیونکہ جب یہ حافظ جی سے اصلاح لیتے تھے اُنھیں دنوں کا یہ ایک مطلع ہے جو شیخ کی جودت طبع کا آئینہ دار ہے۔ مطلع یہ ہے:

ماتھے پہ تیرے جھومے ہے جھومر کا پڑا چاند　　لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

میر کاظم حسین بیقرار جب پیش نہ لے جا سکے تو جا کر شاہ نصیر کے شاگرد ہوگئے اور ایک غزل اُن کی اصلاحی لا کر شیخ مرحوم کو سُنائی۔ شیخ نے کہا کہ بھئی خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہوگئے اور اُنھیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ اب تو شیخ ابراہیم کو بھی شوق چرایا اور اُنھیں کے ساتھ جا کر شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہوگئے، پھر کیا تھا لگے چمکنے، طبیعت کی بلند پروازی نے اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ نوبت بایں جا رسید کہ مشاعروں میں ان کی غزلوں پر لوگ آسمان سر پر اُٹھانے لگے اور واہ واہ کے نعرے بلند ہونے لگے۔ شاہ نصیرؔ نے جو یہ رنگ دیکھا تو شاگرد سے رشک پیدا ہوا اور خیال کیا کہ اس کے آگے میری دال نہ گلے گی، آخر شیخ مرحوم کو نگاہ سے گرا کر کبھی تو غزل بلا اصلاح پھیر دیتے کہ جاؤ طبیعت پر زور ڈالو اور دوسری غزل کہہ کر لاؤ، اور کبھی اصلاح دیتے بھی تو نہایت بے توجہی سے، اس پر بھی غضب یہ تھا کہ شاہ وجیہ الدین منیرؔ جو شاہ نصیرؔ کے اکلوتے صاحبزادے اور براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے اور چونکہ طبیعت میں نوجوانی کا زور تھا اسی لئے کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اور اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے، ان کی غزلوں میں بھی وہی مضامین پائے جاتے تھے جو شیخ مرحوم کی غزلوں سے کاٹ دیئے جاتے تھے۔ شیخ مرحوم کو جب یہ محسوس ہوا تو اُن کو زیادہ رنج ہوا اور سمجھے کہ شاہ صاحب اپنے صاحبزادے کو تو بڑھانا اور مجھ کو گھٹانا چاہتے ہیں، اسی وجہ سے میری اصلاح میں بے توجہی اور پہلو تہی کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ میرے مضمون اُن کی غزلوں میں موزوں کرا دیتے ہیں۔ یہی وہ خیال تھا جس نے آخر استاد شاگردوں میں ان بن ڈال دی اور ایک دوسرے کا حریف بن گیا۔ اسی دوران میں شیخ مرحوم کا جوزور طبع بڑھا تو اُنھوں نے ایک دن سوداؔ کی اس غزل پر غزل کہہ ڈالی۔ جس کا قافیہ وردیف ''آغوش نقش پا اور دوش نقش پا'' ہے، اور شاہ صاحب کے ہی پاس اصلاح کے واسطے لے گئے۔ اب کیا تھا بارود میں آگ لگ گئی۔ شاہ صاحب نہایت برہم ہو کر بولے کہ اب تمھارا یہ حوصلہ ہوا کہ اُستادوں کے منھ آنے لگے، اور اُن کی غزل پر غزل کہنے لگے۔ کہاں مرزا رفیع سوداؔ اور کہاں تم۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ یہ کہہ کر غزل کو پھینک دیا اور شیخ کو بہت بڑا بھلا کہا۔ شیخ مرحوم اگرچہ ایک غریب سپاہی کے لڑکے تھے اور دنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر، لیکن اول تو قابلیت خداداد دوسرے طبیعت بھی غیور پائی تھی، غزل لے کر چلے آئے۔ ادھر یاروں نے اُبھارا کہ اجی بے اصلاحی ہی چل کر مشاعرے میں سناڈالو، لیکن شیخ کو اس میں کسی قدر پس و پیش تھا۔ آخر عین مشاعرے کے روز افسردگی اور مایوسی کے عالم میں یہ گھر سے نکلے اور بے اختیار جی چاہا کہ مشاعرے میں جا کر شریک ہوں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ جامع مسجد تک پہنچے ہی تھے کہ دیکھا وہاں میر کلو حقیرؔ بیٹھے ہوئے ہیں، چونکہ شیخ کے کلام نے روشناس کر دیا تھا اور وہ ان کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ افسردگی کی حالت میں دیکھ کر بولے کہ میاں ابراہیم کس تردد

www.urduacademyts.com

میں ہو۔اس وقت بہت متفکر نظر آتے ہو۔آپ نے شاہ نصیر صاحب کی بے توجہی اور برہمی کی تمام واردات بیان فرمائی۔میر صاحب نے کہا ہم تو وہ غزل سنیں، جب سنائی تو فرمایا کہ جاؤ بیدھڑک مشاعرے میں پڑھ دو، خدا نے چاہا تو تمھیں کامیاب رہو گے، اور اگر کوئی اعتراض کرے تو اس کا جواب دینا ہمارے ذمے۔اور بعد دعا کے رخصت کیا۔شیخ کا دل اُن کے اس کہنے سے بڑھ گیا۔اگر چہ میر صاحب قدیمانہ انداز کے شاعر تھے مگر پرانے شخص اور اُستادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے اور مکتب میں پڑھایا کرتے تھے، اس لئے شیخ مرحوم کو اُن کے اس کہنے سے تسلی ہوگئی اور بے خوف جا کر مشاعرے میں غزل پڑھی تو وہاں تعریفوں کے وہ خلعت ملے کہ شیخ پھولے نہ سمائے۔بس اُسی دن سے یہ جرأت ہوگئی کے مشاعروں میں بلا اصلاحی غزلیں پڑھنے لگے۔لیکن اس کے ساتھ ہی اُستادوں کا ادب اور لحاظ ہمیشہ ملحوظ رکھا، کبھی دوبدو نہ ہوئے۔چنانچہ ایک مرتبہ نواب الٰہی بخش خاں معروف جو کہ ایک عالی خاندان امیر تھے اور شاہ نصیر و غمگین وغیرہ وغیرہ سات اُستادوں سے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔شیخ مرحوم کے گرویدہ ہوگئے اور اُن کا کلام لوگوں کی زبانی سُن کر مشتاق دیدار ہوئے اور شیخ کو بلوا بھیجا۔ملاقات ہونے پر نواب صاحب نہایت اخلاق سے پیش آئے اور بولے کہ بھئی تمھارا کلام دوسروں کی زبانی سنا ہے لیکن تمھارے پڑھنے میں اور ہی مزا ہوگا، کیونکہ ''تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں''

کچھ اپنا کلام سنایئے۔شیخ نے ایک مطلع اُس غزل کا جو کہنی شروع کی تھی سنایا۔مطلع:

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑ کنے جان لگی   چلی تھی برچھی کسی پر کسی پہ آن لگی

نواب صاحب پھڑک گئے۔اسی درمیان میں شیخ کے قدیمی اُستاد حافظ غلام رسول تشریف لے آئے۔شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا جو کہ سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے اور سروقد تعظیم کو اُٹھے۔حافظ صاحب نے چونکہ شیخ سے مکدر تھے کہ میرا شاگرد ہو کر دوسروں کو غزلیں دکھاتا ہے اور میرے مشاعروں میں بھی نہیں جاتا ہے مخاطبت نہ کی اور نواب صاحب کو اپنا کلام سنانے لگے۔شیخ صاحب نے چاہا کہ میں وہاں سے اُٹھ جاؤں، نواب صاحب نے روکا اور چپکے سے کہا کہ میاں ابراہیم کان بدمزہ ہوگئے، خدارا کوئی اپنا کلام سناتے جاؤ۔شیخ نے اپنی ایک غزل کے یہ دو مطلع جو اسی زمانے میں کہی تھے سنائے۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلاً نہیں آتا   گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا   پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آخر کار نواب صاحب شیخ مرحوم کے شاگرد ہوگئے اور دیوان معروف جو اس وقت بھی موجود ہے تمام و کمال شیخ کا اصلاح شدہ ہے۔رفتہ رفتہ شیخ کے کلام کا شہرہ یہاں تک بلند ہوا کہ اکبر شاہ کے ولیعہد مرزا ابوظفر جو شعر کے عاشق تھے شیخ مرحوم کے شایق ہوئے، اور ادھر شیخ مرحوم کو بھی دربار ولیعہد میں جانے کی تمنا ہوئی۔لیکن اس عہد میں بغیر کسی امیر کی ضمانت کے قلعہ میں جانا دشوار تھا، اس لئے شیخ 'میر کاظم حسین بیقرار' کی ضمانت سے جو کہ ولیعہد موصوف کے خاص ملازم تھے دربار ولیعہدی میں شرف یاب ہوگئے اتفاقات زمانہ دیکھئے کہ شاہ نصیر جو ولیعہد صاحب کی غزلیات کی اصلاح کرتے تھے حیدرآباد دکن چلے گئے اور اُن کی جگہ پر میر کاظم حسین بیقرار مقرر ہوئے وہ بھی تھوڑے دنوں بعد جان الفنسٹن صاحب کے میر منشی مقرر ہو کر دہلی کو خیر باد کہہ گئے۔ولیعہد صاحب کو ان دونوں صاحبوں کے جانے کا بہت رواج تھا۔ایک روز شیخ مرحوم جو ولیعہد کی خدمت میں گئے تو وہ بولے کہ میاں ابراہیم استاد تو دکن چلے گئے، میر کاظم حسین بھی چھٹ گئے تم نے بھی ہم کو چھوڑ دیا۔یہ کہہ کر ایک غزل جیب سے نکال کر دی اور کہا کہ ذرا اسے بنا دو۔شیخ مرحوم نے وہیں بیٹھے بیٹھے غزل بنا کر سنائی، ولیعہد صاحب بہت خوش ہوئے اور للعہ، ماہوار بطور وظیفہ سرکار ولیعہد سے مقرر ہوگئے۔شیخ مرحوم روزانہ جاتے اور ولیعہد کی غزلوں کو اصلاح دے آتے۔اگر چہ شیخ مرحوم کے والد کو ان کا قلعہ میں جانا اور للعہ ماہوار پانا نہایت ناگوار تھا۔لیکن یہ کون جانتا تھا کہ یہی چار روپے ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون بن جائیں گے اور جو اس وقت اس حقیر رقم کو شکریہ کے ساتھ قبول کر رہا ہے وہ فیل نشین اور صاحب جاہ و حشم ہوگا۔چنانچہ انتہائے ترقی یہ ہوئی کہ جب ولیعہد صاحب بادشاہ ہوئے تو شیخ مرحوم کی تنخواہ پانچ سو روپیہ سے ایک ہزار روپیہ تک مقرر ہوئی اور خلعت و انعامات اور ہاتھی معہ ہودج زریں وغیرہ علاوہ بریں تھے۔

www.urduacademyts.com

جب شیخ مرحوم کو دربار شاہی سے خاقانی ہند کا خطاب ملا تو لوگوں میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ پرانے شعراء کے ہوتے ہوئے بادشاہ نے ایک نو سیکھیے کو ملک الشعراء بنا دیا اور ایسا عالی درجہ خطاب دیا۔ ایک جلسہ میں یہی باتیں ہو رہی تھیں اور میر کلو حقیرؔ بھی اس میں شریک تھے کہ ایک صاحب نے کہا پہلے اس قصیدہ کو نظر انصاف سے دیکھنا چاہیئے جس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب دیا ہے۔ چنانچہ وہ قصیدہ لا کر سب کو سنایا گیا جس کے مختلف شعروں میں شیخ مرحوم نے طرح طرح کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ایک زبان میں جو ایک شعر تھا اُن کی تعداد اٹھارہ تھی۔ اس قصیدے کا پہلا مطلع یہ ہے:۔

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن　　آب وایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

ظفر شاہ کے لختِ جگر شاہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقع پر جب مرزا غالب مرحوم نے ایک سہرا کہہ کر بڑے طمطراق سے بادشاہ کی نذر کیا اور اس کے مقطع میں شاعرانہ نوک جھونک بھی برتی کہ:

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں　　دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

تو ظفر شاہ کے دل میں یہ خیال گذرا کہ یہ میرے اُستاد شیخ صاب پر چوٹ ہے' اُسی وقت شیخ کو سہرا لکھنے کا حکم دیا۔ شیخ نے برجستہ سہرا کہہ سنایا اور مقطع میں یہ فرمایا:

جسکو دعوی ہو سخن کا یہ سنادے اسکو　　دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

مرزا غالبؔ کو جب اس کی خبر ہوئی تو گھبرائے اور بمعذرت پیش آئے' بادشاہ کو ایک قطعہ گذرانا جس کا ایک شعر یہ بھی تھا:

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

اگرچہ غالبؔ کا سہرا بڑے بلند پایہ کا ہے لیکن ذوقؔ کے سہرے میں ایک قسم کی شیرینی اور سلاست زبان اعلی درجہ کی ہے۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جنھوں نے شیخ کو مرزا رفیع السودا کا جانشین حقیقی منوا دیا اور ملکِ سخن میں ان کا سکہ بیٹھ گیا۔ اس کی بابتہ ایک حکایت یہ بھی قابل ذکر ہے کہ حافظ احمد یار نے جو ایک متقی پرہیز گار شگفتہ مزاج۔ سخن گو۔ سخن فہم۔ انصاف پسند شخص تھے۔ ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہوا ہے اور بمعیت شیخ صاحب مرحوم بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہیں' اور حافظ احمد یار کے والد حافظ عبدالرحیم ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں' اور شیخ صاحب کو اس میں سے چمچے بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ صاحب نے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور یہ جنازہ کس کا ہے' ان کے والد نے کہا کہ یہ مرزا رفیع سوداؔ کا جنازہ ہے اور ابراہیم ذوقؔ ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔

شیخ مرحوم کی قادرالکلامی تو ناظرین پر اس وقت ظاہر ہوتی کہ جب آپ کا کلام بھی دستیاب ہوتا۔ رفتار زمانہ نے اس کو ایسا غائب کیا کہ کہیں پتہ نہ لگا۔ جو کچھ تھوڑا بہت ہاتھ لگ سکا ہے وہ پیش نظر ہے جس سے ہر ایک شخص ذوق سلیم رکھنے والا سمجھ سکتا ہے کہ صفائی زبان' زور سخن اور سادگی زبان میں شعرائے متاخرین دہلی میں سے کوئی شاعر ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ ان کا کلام محاورہ اور ضرب الامثال کا گنجینہ' تشبیہ اور استعارات کا خزینہ' نئے عاشقانہ مضامین کا آئینہ اگرچہ غالبؔ اور مومنؔ کی طرح معنی آفرینی اور نازک خیالی کی دھن میں یہ نہیں پڑے' لیکن پھر بھی ہر ایک شعر تیر و نشتر سے کم نہیں' سلاست زبان دماغ کو شگفتگی بخشتی ہے۔ بڑے بڑے مشکل قافیے اور ردیف میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے اور جن جن مشکل قوانی کو آپ نے نہایت آسان طریقہ سے نظم کر دکھایا ہے ان کو دوسرا شاعر اس خوبی سے نہیں لا سکتا۔ ایک مرتبہ شاہ نصیرؔ نے مشاعرے میں اپنی ایک غزل جو اُنھوں نے دکن میں کہی تھی اور جس کی ردیف آتش و آب و خاک و باد تھی پڑھی اور کہا کہ میں تو جب جانوں کہ وہ اُستاد ہے جو اس میں کوئی غزل سنائے۔ دوسرے مشاعرے میں شیخ نے ایک غزل اسی طرح میں پڑھی' جس پر شاہ نصیرؔ کے ماننے والوں نے کچھ اعتراض بھی کئے۔ بادشاہ کا جشن قریب تھا' شیخ نے زور میں آ کر اسی ردیف میں ایک طولانی قصیدہ کہہ ڈالا' جس کا مطلع یہ ہے:

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب و خاک و باد

یادرفتگاں

www.urduacademyts.com

ضرب الامثال کو پورے کا پورا لانا اُن کا خاص حصہ ہے جس کی نظیر ناظرین کے پیش نظر ہے:۔

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ — ایمان کی کہیں گے ایمان سے تو سب کچھ
پئیں مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری — خدا کی گر نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری
گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا — یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا
گر ابکی پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے — تو جانو پھر سے شیخ جی اللہ کے گھر سے

رباعیوں میں بھی آپ کے وہی بات ہے جو غزلوں اور قصیدوں میں ہے دیکھیئے کیسے قوافی کو کس خوبی سے نظم کیا ہے:۔

رُباعی

دل اپنا غم دہر سے تو کر نہ اُچاٹ — جس طرح کٹے روز مصیبت کو کاٹ
اے ذوقؔ فلک آپ ہے بارہ حصّے — سودا ہو نہ کیوں زیر فلک بارہ باٹ

رُباعی

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کے پیسے — سب کہتے تھے انکو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوقؔ — پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

قطعات کا حسن نظم احاطہ تحریر سے باہر ہے۔اس کی بیساختگی اور زبان کی شیرینی کا کیا کہنا۔ہم ایک قطعہ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش کرتے ہیں:

کہوں اے ذوقؔ کیا حال شب ہجر — کہ تھی اک گھڑی سو سو مہینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اُٹھا یا گاہ اور گا ہے بھٹایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے

چھتیس برس کی عمر میں آپ نے جملہ منہیات سے توبہ کی اور اُس کی یہ تاریخ کہی: ''اے ذوق بگو بار توبہ''

آخر کار جبکہ یہ آفتاب کمال نصف النہار کو پہونچ چکا تو وقت آگیا کہ کارکنان قضاؤ قدر اس کو آسمان دنیا سے منتقل کریں یعنی ۲۴۔صفر ۱۲۷۱ھ بروز جمعرات بعد بیماری سترہ یوم مرنے سے تین گھنٹے پیشتر یہ شعر کہہ کر دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گذر گیا — کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

☆☆☆

ماخوذ از کتاب ''دیوان ذوقؔ'' مع مختصر حالات زندگی و تنقیح کلام از: جناب الحاج مولانا مولوی محمد منیر صاحب۔منیرؔ لکھنوی مصنف کتب کثیرہ ۔مطبع مجیدی کانپور

www.urduacademyts.com

آثارالصنادید کی افادیت اور اہمیت

اس مقالے میں سرسید احمد خاں کی مایۂ ناز تصنیف آثارالصنادید کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے جو دہلی کے آثارِ قدیمہ کی تفصیلی تاریخ ہے۔ یہ کتاب تاریخ اور فنِ تعمیر کا اہم ترین امتزاج ہے جو نہ صرف دلی کے آثارِ قدیمہ کے مطالعہ کے لیے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اُردو زبان میں مقامی تاریخوں کے زمرے میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔ بقول عبدالحق:

''یہی وہ تصنیف ہے۔ جس نے ہندوستانی مسلمانوں میں آثارِ قدیمہ کی بنیاد ڈالی۔'' (سرسید احمد خاں حالات وافکار، عبدالحق، دہلی، ۱۹۶۰، ص۔۱۹)

آثارِ الصنادید کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے سید عبداللہ نے لکھا ہے:

''آثارِ الصنادید انیسویں صدی میں شہر دہلی کے موضوع پر بہترین کتاب ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ سرسید کے معاصرین نے اس کو انتہائی وقعت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ اس کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے کی ایک سے زیادہ کوششیں ہوئیں۔ گارسان دتاسی نے اس کا فرنچ زبان میں ترجمہ کیا۔'' (سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ۱۹۴۴، علی گڑھ، ص۔۴۸۔۴۷)

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کا عنوان ''شہر کے باہر کی عمارتوں کے حال میں ہے'' اس باب میں بیرونی شہر کی تقریباً ۱۳۰ عمارتوں کا مفصل بیان درج ہے۔ ان عمارتوں میں قلعہ تغلق آباد، مقبرہ غیاث الدین تغلق شاہ، مندر کالکا، اکاس مندر، روشن چراغ دہلی، درگاہ یوسف قتال، مسجد کھڑکی، درگاہ شیخ صلاح الدین، مسجد عیسیٰ خاں، مقبرہ عیسیٰ خاں وغیرہ عمارتوں کی تشریح کی گئی ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ''قلعۂ معلیٰ کی عمارتوں کے حال میں'' ہے اس میں لال قلعہ اور اس کی عمارتوں کا حال مذکور ہے۔ اس میں جزوی عنوانات قائم کرکے ان پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں ''دروازہ جنوبی قلعۂ معلیٰ، چھتہ لاہوری دروازہ، دیوانِ عام، امتیاز محل معروف بہ رنگ محل، جھروکہ اسد برج خوابگاہ، مثمن برج، شاہ محل معروف بہ دیوانِ خاص، تسبیح خانہ، موتی محل وغیرہ عمارتوں کا مفصل حال بیان کیا گیا ہے۔ موتی مسجد کے بارے میں جن تفصیلات کو مؤلف نے بیان کیا ہے وہ اس طرح ہیں:

''یہ ایک مسجد ہے۔ سر سے پاؤں تک سنگ مرمر کی ہے اور ایسے گل بوٹے بنائے ہیں کہ دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت میں ایسی مینا کاری تمام قلعہ میں کسی پر نہیں بلکہ قلعہ کیا روئے زمین پر بھی نہ ہوگی۔''

(آثارلصنادید، سرسید احمد خاں، ص۔۳۷)

تیسرے باب کا عنوان ''خاص شہر شاہ جہاں آباد کے حال میں'' ہے۔ اس باب میں شہر شاہ جہاں آباد کی عمارتوں،

www.urduacademyts.com

مسجدوں، مدرسوں، حویلیوں، کنوؤں، باولیوں، مندروں، بازاروں، مزاروں وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ چوتھے اور آخری باب کا عنوان ''دلّی اور دلّی کے لوگوں کے حال میں'' ہے۔ اس باب میں پہلے تو دلّی کے متفرق ناموں، اس کی آب وہوا اور یہاں کی زبان اُردو کے ارتقاء سے بحث کی گئی ہے۔ پھر شاہ جہاں آباد کے باشندوں کی بابت لکھا ہے۔

''اگر چہ لوگ یہ خیال ظاہر کریں گے کہ میں نے اس شہر کے لوگوں کا حال لکھا وہ نظر یہ حب الوطن ہوگا، لیکن جن لوگوں کے مزاج میں انصاف ہے وہ میری اس ساری کتاب کو دیکھ کر جان لیں گے کہ میں نے جو حال لکھا ہے وہ افراط و تفریط سے خالی ہے۔ حقیقت میں یہاں کے لوگ ایسے ہیں کہ شاید کسی اقلیم کے نہ ہوں گے۔ ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے۔ ہر ایک کو علم و ہنر سے شوق اور ذوق ہے۔'' (آثارلصنادید، سرسید احمد خاں، باب چہارم، ص۔۱۰)

اس کے بعد انھوں نے دہلی کے تقریباً ۱۲۰ مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے جو کہ نہایت جامع ہے، جس میں مشائخ، علماء، فقراء، اطبّا، شعراء، خوش نویس، مصوّر، موسیقار وغیرہ سبھی طرح کے فن کار شامل ہیں۔ مشائخین کے زیر عنوان ان کے مختلف سلسلوں کا بھی الگ الگ ذکر ہے۔ مثلاً رسول شاہیوں وغیرہ کا سلسلہ۔ مشائخین کے حالات میں عام رواج کے برعکس خوراک، عادات کا نام نہیں بلکہ ان کے اخلاق وکردار وغیرہ کا مفصل بیان ہے۔

اس طرح سرسید نے تاریخ ولادت، تاریخ وفات دینے کی بھی حتیٰ الامکان کوشش کی ہے۔ شاعروں میں بالخصوص ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شاہ نصیر شیفتہؔ وغیرہ کی شخصیت اور فن سے تفصیلی بحث کی ہے اس کے علاوہ ان شاعروں کے مختصر حالاتِ زندگی وانتخابِ کلام اور دیگر اُردو فارسی تصانیف کے نمونے اور ان پر تبصرے بھی ہیں۔ ان میں غالبؔ کا ذکر سب سے پہلے اور سب زیادہ بسیط ہے۔ غالبؔ کی اور دلّی اسکول کی تعریف کی ہے۔ سید عبداللہ کا اس باب کے بارے میں کہنا ہے کہ:

''کتاب کا چوتھا باب اپنے مطالب کے اعتبار سے قیمتی باب ہے کیونکہ اس میں اس زمانے کے مشاہیر کا مستند حال درج ہے اور ایک لحاظ سے دہلی مرحوم کے آخری دور کی یہ زندہ یادگاریں، پرانے ایوانوں کے شکستہ در ودیوار اور قدیم مسجدوں اور عمارتوں کے بوسیدہ گنبدوں اور چبوتروں سے کچھ کم اہم نہیں کیونکہ دہلی کے زوال پذیر عظمت کی یہ چلتی پھرتی نشانیاں جن میں مرزا غالبؔ، نواب ضیاء الدین خاں، مفتی صدرالدین اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ جیسے مشاہیر شامل ہیں جو شاہ جہاں آباد کے انداز ماضی کا زندہ ثبوت مہیا کرتے ہیں۔'' (سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ۱۹۴۴، علی گڑھ، ص۔۴۹)

غرض کہ یہ چوتھا باب اپنی نوعیت کے اعتبار سے اگر شاعروں اور مذہبی تذکروں سے الگ ہے تو سیر رجال سے بھی مختلف ہے اور اپنی گوناگوں عناصر کی وجہ سے اپنی مثال آپ

www.urduacademyts.com

ہے۔اس باب کے آخر میں مرزا غالبؔ کی فارسی نثر میں تقریظ اور امام بخش صہبائیؔ کا فارسی میں تبصرہ شامل ہے۔ مولوی صدرالدین آزردہ کی منظوم فارسی تقریظ کے بعد اس کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے۔اس باب کو ۱۸۵۴ء میں دوسری اشاعت کے وقت نکال دیا گیا تھا۔اس بارے میں سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

''بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز ایڈورڈ ٹامس کی تجویز سے کی گئی ہوگی جو اشاعت ثانی کے وقت سرسید کے مشوروں میں شریک تھے۔اس میں مصلحت غالباً یہ تھی کہ یہ کتاب صرف آثار وعمارات کے بیان کے لیے مخصوص ہو جائے اور مشاہیر کا تذکرہ چونکہ ان میں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے اس لیے کتاب سے خارج کر دیا جائے۔'' (سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء، سید عبداللہ، ۱۹۴۴، علی گڑھ، ص۔۵۶)

تاریخ اور فنِ تعمیر کے لحاظ سے آثارالصنادید اہمیت کی حامل ہے، اس بارے میں پروفیسر عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ:

''آثارالصنادید'' میں مغربی انداز کی آثارِ قدیمہ سے دلچسپی کارفرما ہے موجودہ عہد سے پہلے فارسی کی تاریخ نویسی میں عمارات اور کتبات پر رسالے لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اگر اس بات میں شک ہو تو سٹوری اور دوسرے مستند مصنفوں کی فہرستیں دیکھی جاسکتی ہیں۔آثارالصنادید کا چوتھا باب (تذکرہ اہل دہلی) تو یقیناً تذکروں کی روایت پر لکھا گیا ہے اور پہلے باب کے جدول یا نقشہ (دہلی کے حکمرانوں کی فہرست) میں جام جم کی جھلک ہے لیکن دوسرے اور تیسرے ابواب جدید ترین علوم آثارِ قدیمہ وکتبات Archoeology and Epigraphy کے اثرات سے لبریز معلوم ہوتے ہیں۔عمارتوں کی تصویریں اسی انداز میں بنائی اور چھاپی گئی ہیں جیسے انگریز مصنف کیمرہ کے استعمال سے پہلے لکڑی Wood Cuts یا پتھر Lithography کے چھاپوں سے شائع کرتے تھے۔ اسی طرح سرسید احمد خاں نے دہلی کے جن کتبوں کی نقلیں دی ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم ترین کتبات یعنی اشوک کے ستونی فرامین کو اصل براہمی رسم الخط میں دیا گیا ہے مہرولی کے آہنی مینار کے کتبہ کو بھی اصل خط میں شائع کیا گیا ہے اور بلبن کے عہد کے پالم باولی کے سنسکرت کتبے کا اصل متن ترجمہ کے ساتھ درج ہے۔قطب مینار کے کتبوں کو ان کی اصلی شکل اور پھر خط نستعلیق دونوں میں دیا گیا ہے۔'' (سرسید احمد خاں اور تاریخ نویسی، پروفیسر عرفان حبیب، فکر وآگہی، (علی گڑھ نمبر) ۲۰۰۰، ص۔۱۲۳)

آثارالصنادید کے مطالعہ سے سرسید کی تاریخی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔اس بارے میں خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ:

''سرسید نے جس ذوق انہماک اور تاریخی بصیرت کے ساتھ اس کا مواد جمع کیا وہ حیرت انگیز ہے۔قطب مینار کے کتبے پڑھنے کے لیے جب وہ چھینکے میں بیٹھا کر اوپر سے اُتارے جاتے تھے تو ان کے دوست صہبائی خوف سے کانپنے لگتے تھے۔ سرسید کا بھاری جسم قطب کی بلندی، چھینکوں کی ناپائیداری سب اپنی جگہ تھی لیکن ان کا جذبۂ تحقیق اس وقت تک تشنہ رہتا تھا جب وہ خود ایک ایک کتبہ کا چربہ نہ لے

www.urduacademyts.com

لیں۔'' (سرسید احمد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے، پروفیسر خلیق احمد نظامی، دہلی، ۱۹۹۳ء، ص۔۱۴۳)

اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے C.W.Troll لکھتے ہیں:

"A number of buildings which Sir Sayyid described in Asar did not survive the sack of Delhi, and hence the work is one of the best record of the Pre-1857 City and Society"۔(C.W. Troll 'A Note on an EarlyTopographical work of Sayyid Ahmad Khan : Asar-Ul- Sanadid, JR As (1972)PP.135-46.)

آثارالصنادید کے مختلف ایڈیشن:

آثارالصنادید طبع اوّل (۱۸۴۷ء):

آثارالصنادید کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں طبع ''سید الاخبار'' سے شائع ہوا۔ اس ایڈیشن کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم کا کہنا ہے:

''چار ابواب میں تقسیم یہ ایڈیشن چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اور ہر باب کے صفحات نمبر الگ ہیں۔ اس میں دلّی کی ایک سو اٹھائیس عمارتوں کے خاکے ہیں جنھیں دو مصوروں مرزا شاہ رخ اور فیض علی خاں نے بنوایا تھا۔ ابتداء میں یہ کتاب تھیا فلس طامس مٹکاف کے نام معنون کی گئی ہے۔ مقدمے مٹکاف کی نثری مدح کے علاوہ اٹھہتر اشعار کا فارسی قصیدہ بھی شامل ہے۔'' (آثارالصنادید، سرسید احمد خاں، جلد اول، مرتبہ۔ خلیق انجم، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۔۱۵۸)

پروفیسر مشیرالحسن کا اس ایڈیشن کے بارے میں کہنا ہے کہ:

In the first edition of Asaru's Sanadid (The Vestiges of the Great) a Study of Delhi's ruin and extant monuments Published in 1847, Saiyid Ahmad included a chapter on the most successful well known of the traditional intellectual elites. He extravagantly complimented them. (Maulvi Zaka Ullah, Sharif culture and colonial rule, Mushirul Hasan (Article Produced in "The Delhi College ed Margrit Pernau P-267.)

اس ایڈیشن کی عبارت رنگین و مقفّیٰ ہے۔ آسان اور عام فہم نہیں ہے۔ حالی کا اس ایڈیشن کی عبارت کے بارے میں کہنا ہے:

''اس ایڈیشن کی عبارت قدیم طرز کی رنگینی اور مبالغہ اور تکلفات باروہ کے سبب آج کل کے مذاق کے موافق بہت پھیکی اور بے مزہ ہوگئی تھی اور اس کے سوا اس میں اور بھی بہت سی فروگذاشتیں تھیں۔'' (حیاتِ جاوید، حالی، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص۔۶۸)

www.urduacademyts.com

زیڈ۔ایچ۔فاروق کے مطابق:

This edition had certain defects, for example, the drawing of the monuments were complete, but the related inscriptions had remained incomplete and were not correctly copied. The Languages of the book was ornamental and at Places exaggerated. (Sir Sayyid And Maulana Shibli, Z.H. Faruqi, reproduced articles Historians of Medieval India, Muhibbul Hasan, P-235.)

اس طرح اس میں فارسی عربی ترکیبیں اور تشبیہات واستعارات کے ساتھ پرانا اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔

نمونہ عبارت آثار الصنادید طبع اوّل:

(بعد حمد ونعت)

''بہتر ہے کہ فکرِ مآل اندیش اس داعیۂ محال سے ہاتھ اُٹھا کر اپنے انداز سے باہر پاؤں نہ نکالے اور اس امرِ صعب میں ہاتھ نہ ڈالے۔اس واسطے خاک پائے اہلِ ہنر خوشہ چینِ معنی طرازانِ سخنور، اُمیدوارِ رحمتِ صمد سید احمد مخاطب بخطاب جوادالدولہ عارفِ جنگ بیٹا سید محمد متقی خاں بہادر مرحوم اور پوتا جوادالدولہ جوادعلی خاں مرحوم اور نواسہ نواب دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کا دانایان اوّلی الابصار اور صاحب طبعانِ روزگار کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانۂ پُر بہانہ سے نجات حاصل ہوجاوے اور فلک ناتواں بیں کے پنجے سے کچھ مہلت ہاتھ آوے تو ایک نسخۂ عجیب اور مجموعۂ غریب خامۂ چابک رقم کی مدد اور فکر آسماں سیر کی عنایت سے لکھا جاوے کہ عمارت سوادِ حضرت شاہ جہاں آباد **حَرَسَہ اللہ عَنِ الفَسَاد** (اللہ فساد سے اُسے بچائے رکھے) اور مکانات درون شہر اور قلعۂ مبارک کا حال اس میں مندرج اور اطوار واوضاع ساکنینِ شہر کا حال اس میں مندرج (داخل) ہو۔''

باب دوم: قلعۂ معلّٰی کی عمارت کے حال میں:

''زہے بلند پایہ حصار کہ اگر آسمان اس کے ایک برج کے کلس کی وسعت پیدا کرے کلاہِ تفاخُر کو اپنے سر پر کج رکھے اور اگر سپہر بریں اس کے ایک کنگرے کی رفعت بہم پہنچاوے، اپنے جامے میں نہ سماوے، اندیشہ اُس کی بلندی دیوار کے اندازہ کرنے میں حیران اور عقل اس کی وسعت کی تحقیق میں سرگردان، اس کی دیواریں آسمان کی پشتیان اور اس کی خندق عبرتِ محیط وعمّان، یہ قلعہ زمان دولت اور عہد سلطنت شہاب الدین محمد شاہ جہاں (اللہ متوّر کرے بھید اس کے) میں بنا ہے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ بموجب فرمان قضا جریان اس بادشاہ کے یہ قلعہ بننا شروع ہوا اور سال دوازدہم جلوسِ شاہجہانی میں مطابق شبِ جمعہ دوازدہم ذی الحجہ ۱۰۴۸ ہجری مطابق ۹۔اُروے ۵۶۱ ملک شاہی کی اچھی سے اچھی ساعت دیکھ کر اُستاد احمد اور اُستاد حامد معماران نے کہ اپنے فن میں اپنا اپنا نظریہ رکھتے تھے اور

www.urduacademyts.com

ہندسہ وحساب میں ثانی اقلیدس اور رشکِ ارشمیدس تھے ‘اس قلعے کی بنیاد رکھی۔‘‘

عبارتِ خاتمہ

’’الحمدللہ کہ یہ کتاب تمام ہوئی اور دست وقلم کو جو گردش دائمی اور گریۂ مدام سے فارغ نہ تھے آسودہ ہوئے۔فکر کو تسکین اور طبیعت کو اندیشے سے آسودہ بہم پہنچی خدا کرے کہ مقبول صاحب نظران پر ہنر ہو۔‘‘

آثارالصنادید (طبع دوم) ۱۸۵۴ء:

آثارالصنادید کا دوسرا ایڈیشن جدید ترتیب ونظر ثانی کے بعد ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا۔اس ایڈیشن میں دہلی کے شعراء، علماء، صوفیا اور دوسرے فن کاروں وغیرہ کے احوال کو اس کتاب سے نکال دیا گیا جس کے نتیجے میں یہ کتاب دہلی کی مقامی تاریخ کی تحقیق کا اہم مآخذ بن گئی۔’’بڑی خوبی اس نئے ایڈیشن میں یہ ہے کہ اس کی عبارت میں بہ نسبت پہلے ایڈیشن کے نہایت سادگی ہے اور اس کا بیان ایشیائی مبالغوں اور تکلفات بارده سے بالکل پاک ہے۔اس ایڈیشن کے لیے سرسید نے نقشے بھی ازسرنو کمال اہتمام سے نہایت عمدہ تیار کرائے تھے۔مگر ابھی چھپنے بھی نہ پائے تھے کہ غدر ہوگیا اور وہ سب نقشے تلف ہوگئے۔ (حیاتِ جاوید، حالی، دہلی، ۱۹۹۹، ص۔۶۷)

’’اس ایڈیشن کے پہلے باب میں ہندوستان کی آبادی اور پرانی عملداریوں کا ذکر ہے جو پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔دوسرے باب میں دہلی کے تمام قلعوں کا مکمل بیان ابتداء سے آخر تک درج ہے۔جب کہ پہلے ایڈیشن میں صرف شاہجہاں آباد کے قلعہ کا حال لکھا ہے۔اس میں عمارتوں کا حال زمانی اعتبار سے ترتیب سے دیا گیا ہے۔اس ایڈیشن کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخی شواہد اور اسناد کے ساتھ ساتھ حواشی اور حوالوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔اسی طرح اس ایڈیشن کا اختتامیہ اُردو زبان کے بیان میں درج ہے۔ جب کہ پہلے ایڈیشن کے چوتھے باب میں اہلِ دلّی کا مفصل حال درج ہے۔‘‘

طبع سوم ۱۹۰۴ء:

آثارالصنادید کا تیسرا ایڈیشن منشی رحمت اللہ خاں نے نامی پریس کانپور میں ۱۹۰۴ء میں شائع کیا۔اس میں پہلے دونوں ایڈیشنوں کی خوبیاں موجود ہیں۔

ان ایڈیشنوں کے علاوہ آثارالصنادید کے اور مختلف ایڈیشن اور ری پرنٹ بھی شائع ہوچکے ہیں۔۱۹۰۰ء مطبع نول کشور پریس لکھنؤ سے آثارالصنادید کے پہلے ایڈیشن کا ایک اور ری پرنٹ شائع ہوا یہ جلد انجمن ترقی ہند (دہلی) میں ہے۔اس کے علاوہ ۱۸۷۶ء، ۱۹۰۴ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۶۶ء میں مختلف ایڈیشن شائع ہوئے۔

پروفیسر عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ:

’’اپنی نوعیت کی یہ اتنی اہم تصنیف تھی کہ نہ صرف سید احمد خاں کی زندگی میں اس کے تین ایڈیشن شائع ہوئے (دوسرا ایڈیشن دہلی ۱۸۵۴، ۱۸۵۳ اور تیسرا لکھنؤ ۱۸۷۶ء) بلکہ اس کا ترجمہ فرانس کے مشہور مستشرق گارسان دتاسی نے ۱۸۶۱ء۔۱۸۶۰ء میں شائع کیا۔‘‘ (سرسید احمد خاں اور

www.urduacademyts.com

تاریخ نویسی، پروفیسر عرفان حبیب، فکر و آگہی، (علی گڑھ نمبر) ۲۰۰۰، ص۔۱۲۳)

۱۹۹۰ء میں ڈاکٹر خلیق انجم نے آثار الصنادید کا تین جلدوں میں نیا ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ایڈیشن پہلی بار ایسا مستند اور بہت ہی سائنٹفک انداز میں مرتب کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے جن عمارتوں کے بارے میں بتایا ہے ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی حواشی میں ان عمارتوں کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے بعد ان عمارتوں کی کیا حالت ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان عمارتوں کی بہت اچھی کتابیات تیار کی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ فارسی، انگریزی اور اُردو میں متعلقہ عمارتوں کا ذکر کس کس کتاب میں کس کس صفحہ پر ملتا ہے۔ یہ کام اُردو میں پہلی بار کیا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے دہلی کی جن اہم شخصیتوں کے حالات لکھے تھے، ڈاکٹر خلیق انجم نے حواشی میں ان شخصیتوں کے حالات میں اہم اضافے کیے ہیں۔

یہ ایڈیشن ان تمام ایڈیشنوں سے مختلف ہے جنھیں محققین نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس ایڈیشن میں ڈاکٹر خلیق انجم نے ہندو مسلم فنِ تعمیر پر پونے دو سو صفحے کا مقدمہ لکھا ہے۔ جس کے بارے میں خورشید پرویز صدیقی صاحب نے اپنے ایک مقالے ''آثار الصنادید ایک جائزہ'' میں لکھا ہے:

''تقریباً پونے دو سو صفحات کا گراں قدر مقدمہ اُردو ادب میں منفرد ہے۔ مقدمہ کیا ہے ایک مکمل تصنیف ہے۔ علم کا خزینہ ہے۔ معلومات کا ایک دفتر اُردو زبان میں غالباً اپنی نوعیت کے لحاظ سے اوّلین کوشش ہے۔ اس بسیط اور پر مغز مقدمے کے لیے اُردو ادب جناب انجم کا ممنون رہے گا۔''

(زبان و ادب، پٹنہ، ماہی، جلد ۲۱، شمارہ۔۱، ص۔۶)

اس طرح سے سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید نہ صرف دہلی کے آثارِ قدیمہ سے متعلق اہم ترین دستاویز ہے بلکہ یہ تہذیبی تاریخ بھی ہے جس میں عالم، صوفی، طبیب، خوش نویس، شاعر، موسیقار وغیرہ مشاہرین کا تذکرہ بھی ملتا ہے، جس سے اس عہد کی دہلی کی تہذیبی جھلکیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ڈاکٹر شہناز بیگم، اسسٹنٹ پروفیسر
3234، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔110006
موبائل نمبر:۔9899730241

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف، خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروا رہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔

ادارہ قومی زبان

www.urduacademyts.com

خداشناس شہزادی جہاں آرا

مغلیہ سلطنت کا چراغ بھارت میں تین سوسال سے زیادہ عرصے تک جلتا رہا۔مغلیہ سلطنت نے بھارت کو سونے کی چڑیا بنایا اور ساتھ ہی تہذیب، ثقافت کو ایک نئی جلا بخشی۔اس سلطنت نے بھارت میں عوام کی معیار زندگی کو اعلیٰ مقام دیا جبکہ فن تعمیر میں ایسی ترقی کی کہ رہتی دنیا تک بھارت کا نام سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ مغلیہ سلطنت کی اس بے باک اور شاندار ترقی میں کسی ایک فرد واحد کی کوششیں و کاوشیں نہیں بلکہ کئی ایک بادشاہوں اور شہزادوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔مغلیہ سلطنت کے بادشاہوں اور شہزادوں نے ہی نہیں بلکہ شہزادیوں نے بھی بھارت کی اس ترقی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ان میں جہانگیر کی اہلیہ نور جہاں، شاہجہاں کی دختر جہاں آرا، جبکہ اکبر کے دور میں ''ماہنم آنگا'' اہم ترین خواتین تھیں، جن کا عمل دخل سیاست اور معاشیت میں حد درجہ بلند تھا۔ان تمام مغل زادیوں میں ''جہاں آرا'' ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔جہاں ایک طرف مورخوں نے ان کی ذہانت، بہادری، سیاست اور بردباری پر کئی صفحات لکھے ہیں وہیں یوروپی مورخین نے ''جہاں آرا'' کی نیک نامی کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ان میں برنیر، منوچی، اورٹیور نیر پیش پیش ہیں۔ضیا الدین احمد برنی اپنی کتاب ''جہاں آرا'' میں یوروپین مورّخوں کی بدحواسی اور بدمعاشی کی دو وجوہات بیان کرتے ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ تھی کہ جہاں آرا نے کبھی شادی نہیں کی، جس کے باعث یوروپی مورخوں نے جہاں آرا کی نیک نامی کو بدنام کیا۔دوسری وجہ یہ کہ اورنگ زیب عالم گیر نے انگریزوں کو ملک کے کئی مقامات سے ملک بدر کر دیا تھا۔اس کی زندہ مثال ''جنگ چائلڈ'' ہے۔ 1686 میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے چٹ گاوں پر قبضہ کی حماقت کی تھی۔ انگریزوں نے عرب ساگر اور بنگال میں مغل جہازوں کا راستہ روکا تھا اور کچھ جہازوں کو لوٹ لیا تھا۔اس کے جواب میں مغل فوج کے ہاتھوں انگریزوں کو بدترین ہزیمت اٹھانی پڑی۔اس کے علاوہ انگریز جرنلس کو اورنگ زیب عالم گیر کے دربار پہنچ کر فرش کے بل لیٹ کر معافی مانگنی پڑی۔[1] یہ وہ عوامل تھے جس سے انگریز، یوروپین سخت ناراض تھے۔انگریز اور یوروپی مورخوں نے اپنی کتابوں میں جھوٹی کہانیوں کو گھڑ دیا اور اورنگ زیب عالم گیر اور ان کی بہن جہاں آرا پر کئی الزامات عائد کئے۔یوروپی مورخین نے جہاں اورنگ زیب عالم گیر کو ہندو مخالف، بے رحم لکھا تو دوسری جانب ''جہاں آرا'' کی پاک دامنی پر بھی بد نیتی کے داغ لگائے۔مگر ان کی اوچھی حرکتیں زیادہ دنوں تک چل نہیں سکیں۔ بھارتی تاریخ دانوں نے اورنگ زیب عالم گیر اور ان کی بڑی بہن جہاں آرا کو رحم دل، خوش اخلاق، انصاف پسند قرار دیا ہے۔سترویں صدی مغلیہ سلطنت کے لئے ایک اہم سنگ میل رہی۔ بڑی منتوں، آزمائشوں اور امیدوں کے بعد

www.urduacademyts.com

شہا ب الدین محمد خرم کو آخر کار بادشاہت مل ہی گئی ۔ شہاب الدین محمد خرم 'شاہ جہاں' کے خطاب سے سن 1628ء میں ہندوستان کے تخت پر بیٹھے۔شاہجہاں کے بادشاہ بننے کے بعد جہاں آرا بھی ترقیوں کے زینے طے کرتی چلی گئیں ۔ جہاں آرا اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اور شاہجہاں اپنی بیٹی جہاں آرا کو بے انتہا عزیز رکھتا تھا۔ ضیاالدین برنی لکھتے ہیں کہ:

شاہ جہاں 14 فروری 1628ء کو تخت نشین ہوا۔ اس دن سے جہاں آرا کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ وہ اب معمولی شہزادی نہ تھی بلکہ قرانِ ثانی شہنشاہ ہند کی سب سے بڑی صاحبزادی تھی، جس کے وسیع مقبوضات بنگال سے لے کر سرحد ایران تک پھیلے ہوئے تھے۔

شاہجہاں کی اپنی بیٹی جہاں آرا سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دربار میں جتنی تقاریب ہوتیں، جہاں آرا کو بیش قیمت تحائف دیئے جاتے تھے ۔ شاہجہاں کی تاج پوشی کا جشن کئی روز تک جاری رہا۔اس درمیان جہاں آرا پر بھی شاہجہاں کی فراخ دلی جاری رہی ۔ شاہی دربار میں بادشاہ نے جہاں آرا بیگم کو بادشاہ بیگم کا خطاب عطا کیا۔اور اس کے ساتھ ایک لاکھ اشرفیاں اور چار لاکھ روپیہ بھی عنایت کئے ۔اور سالانہ چھے لاکھ روپیہ کا وظیفہ مقرر کردیا۔جشن نوروز کے موقع پر بھی شاہجہاں نے شاہزادی کو جواہرات اور زیورات عطا کئے۔ جن کی مجموعی قیمت ۲۰ لاکھ سے کم نہ تھی۔(جہاں آرا: ضیاالدین برنی، صفحہ:۷)

شاہ جہاں کی اپنی بڑی بیٹی سے اس قدر محبت کی کئی ایک وجوہات تھیں ۔ جہاں آرا ملنسار، حاضر دماغ، سیاسی حکمت عملی کی ماہر تھی۔اپنے دورِ حکومت میں شاہجہاں اپنی بیٹی جہاں آرا سے بسا اوقات مشورے بھی لیا کرتا اور اس پر عمل بھی کرتا۔اکثر و بیشتر شاہی مہر جہاں آرا کے پاس ہی ہوتی۔اپنی اہلیہ کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے اس کی آدھی دولت جہاں آرا کے نام کی جبکہ باقی آدھی دولت اپنی دیگر اولادوں کے نام کردی۔

''ممتاز محل کی وفات کے بعد اس کے تمام زر و جواہرات جن کی قیمت ایک کروڑ روپیہ سے زائد تھی جہاں آرا کو عطا کئے اور باقی نصف اپنی اور اولاد میں تقسیم کر دیا۔''
(جہاں آرا: مولوی محبوب الرحمٰن، صفحہ۱۳ (اشاعت ۱۹۰۶)

اپنی والدہ ممتاز محل کے انتقال کے بعد جہاں آرا سیاسی و معاشی طور پر دربار پر حاوی ہوچکی تھی۔مگر تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جہاں آرا نے اس عہدے اور شاہجہاں کے بھروسے کا، کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا، بلکہ اس نے ہمیشہ اپنے بھائیوں کے درمیان آپسی اتحاد کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ شاہجہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ ولی عہد تھا، مگر اورنگ زیب عالم گیر اور مراد، دارا شکوہ کو ولی عہد بنائے جانے کے سخت خلاف تھے۔ بادشاہ بننے کی خواہش نے ہی بھائیوں میں دشمنی کے بیج بو دیئے تھے۔ جہاں آرا نے اس دشمنی کی فصل کو کبھی سیراب ہونے نہ دیا۔ دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں دشمنی کس حد تک تھی اور جہاں آرا بھائیوں اور شاہجہاں

www.urduacademyts.com

کے درمیان کس قدر صلح کی کوشش کر رہی تھی۔اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''آگرہ میں داراشکوہ نے اپنا نیا مکان دکھانے کے لئے شاہجہاں اور اپنے تینوں بھائیوں کو دعوت دی۔گرمی کا موسم تھا اس لئے داراشکوہ اپنے مہمانوں کو تہ خانے میں لے گیا۔اتفاق سے اس کا صرف ایک ہی دروازہ تھا۔سب لوگ اندر چلے گئے مگر اورنگ زیب دروازے پر بیٹھ گیا۔ شاہجہاں نے اندر بلایا مگر اورنگ زیب اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس حرکت کی وجہ سے کئی ماہ تک بادشاہ کا عتاب اس پر رہا۔ لیکن بعد میں اورنگ زیب نے جہاں آرا سے یہ بیان کیا کہ چونکہ دروازہ ایک ہی تھا، اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ دارا تخت نشینی کی غرض سے شاہجہاں اور دیگر بھائیوں کو مار ڈالے۔ اس لئے میں بطور چوکیدار دروازے پر ڈٹا کھڑا رہا۔جب جہاں آرا نے شاہجہاں کو اس کی تفصیلات بتائیں تو شاہجہاں نے اورنگ زیب کی خطا معاف کر دی''۔(تاریخ اورنگ زیب' جلداول' صفحہ۷۶ سے ۷۹)

جہاں آرا نے ہر ممکن کوشش کی کہ بھائیوں کو تخت کے لئے خانہ جنگی سے روکے رکھے اور کئی بار حاضر دماغی سے اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا بھی چاہا۔

جہاں آرا نے چاروں بھائیوں میں صلح کرانے کی کوشش کی۔اس نے یہ تجویز نکالی کہ دارا کے پاس پنجاب اور اس کے متعلقہ علاقہ جات رہیں، مراد بخش کے پاس گجرات، شجاع کے پاس بنگال، محمد سلطان کے پاس دکن اور باقی ماندہ حصہ اورنگ زیب کے پاس رہے۔اس کے علاوہ اورنگ زیب کو ولی عہد سلطنت گردانتے اور خطاب شاہ بلند اقبال دارا سے واپس لے کر دینے کا وعدہ کیا۔مگر ان سب باتوں کے جواب میں اورنگ زیب نے داراشکوہ کی برائیاں لکھیں۔ (جہاں آرا : مولوی محبوب الرحمٰن' صفحہ ۲۱-۲۲)

ان کاوشوں سے جہاں آرا کی سیاست حکمت عملی کا اندازہ ہوتا ہے کہ شہزادی کو مغلیہ سلطنت کی ٹوٹتی بکھرتی طاقت اور بھائیوں کی آپسی دشمنی کا کتنا رنج تھا۔ دیگر شہزادوں اور شہزادیوں کی طرح وہ فائدے کے لئے سیاسی حکمت عملی کا استعمال نہیں کر رہی تھی۔اگر ہم ہمایوں کے دور حکومت سے ہی مغلیہ سلطنت پر سرسری نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کو اپنی سلطنت واپس پانے کے لئے اپنے بھائیوں سے میدان جنگ میں اترنا پڑا۔ جہاں گیر نے اکبر سے اور شاہجہاں نے بھی جہاں گیر سے بغاوت کی تھی۔ یہ بغاوت اور آپسی دشمنی تخت شاہی کے لئے ہی تھی۔ان تمام باتوں سے جہاں آرا باخوبی واقف تھی اور اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ مورخ ایک بار پھر تخت نشینی کے لئے مغل شہزادوں کے قتل کے واقعات رقم کرے۔لاکھ کوششوں کے باوجود بھی جہاں آرا ''سموگڑھ'' کی لڑائی کو نہیں روک سکی اور اس جنگ کے بعد داراشکوہ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔شہزادہ مراد ''علی نقی'' کے قتل میں واجب القتل ہوا جبکہ شہزادہ شجاع فرار ہو چکا تھا۔اورنگ زیب کے ہاتھ میں پوری مغلیہ سلطنت آچکی تھی اور شاہجہاں کو اب آنے والی تمام زندگی قید و بند میں

www.urduacademyts.com

گزارنی تھی۔ ایسے میں جہاں آرا نے اپنے والد کا ساتھ دیا اور بیش قیمتی زندگی کے آٹھ سال شاہجہاں کی خدمت میں گزار دیئے۔

جہاں آرا مرتے دم تک باپ کی خدمت کرتی رہی اور آٹھ سال کا طویل زمانہ اس نے جس خوبصورتی کے ساتھ بسر کیا اس کا افسانہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس نے اپنے باپ کی سخت مصیبت کے زمانہ میں نرس اور خادمہ کے طور پر خدمت کی۔ مولوی یزدانی صاحب کا یہ خیال بہت درست ہے کہ اگر مغل دربار میں شیکسپیئر جیسا شاعر موجود ہوتا تو جہاں آرا کی زندگی کو دیکھ کر غم انگیز داستان لکھتا۔ (جہاں آرا ؛ ضیاالدین برنی، صفحہ : ۲۳ اور ۲۴)

شاہ جہاں کے ایام نظر بندی میں جہاں آرا کی خدمت پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جادھوناتھ سرکار رقم طراز ہیں کہ'' جہاں آرا کی محبت وعقیدت اس کے دیگر بچوں کی بدسلوکی کا کوئی کفارہ تھی۔ یہ شاہزادی حضرت میاں میر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی مرید تھی اور قلعہ آگرہ کے حرم میں راہبانہ زندگی بسر کرتی تھی اور اپنے بوڑھے اور بے کس باپ کی ماں اور بیٹی کی محبت کے ساتھ خدمت کرتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ قلعہ میں دارا اور مراد کے یتیم بچوں کی بھی خبر گیر کرتی تھی جنھیں اس نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ ایسی ہی روحانی صحبت میں رہ کر شاہ جہاں سفر آخرت کی تیاری کر رہا تھا۔

(جہاں آرا: ضیاالدین احمد برنی، صفحہ ۵ (اشاعت:۱۹۶۱)

شاہجہاں کی اولادیں دو حصوں میں بٹ چکی تھی۔ ایک اورنگ زیب کا ساتھ دے رہے تھے جبکہ دوسرا گروپ شاہجہاں کے ساتھ تھا۔ اس گروپ بندی میں داراشکوہ اور مراد دونوں جان سے مارے گئے اور خود شاہجہاں کو عمر قید ہوگئی جہاں آرا نے بہت حد تک اپنے آپ کو اس گروپ بندی سے دور رکھا۔ جہاں آرا نے سات سال تک اپنے بزرگ والد کی خدمت ایک ماں، بیٹی اور نرس کی حیثیت سے کی اور اپنے لئے جنت کی راہ ہموار کر لی۔ جہاں آرا کی زندگی کے کئی پہلو ملتے ہیں جہاں ایک طرف بادشاہ بیگم کی شاندار زندگی گزاری، دوسری طرف سات سال تک قید و بند کی زندگی صرف کی، شاہجہاں کی موت کے بعد دوبارہ شاہی محل میں واپس آئیں اور پھر دوبارہ بادشاہ بیگم کی زندگی گزاری۔ مرتے دم تک مغلیہ سلطنت کی ترقی وترویج کے لئے کوشاں رہی۔ شاہجہاں کے انتقال کے بعد اورنگ زیب عالم گیر نے اپنی بڑی بہن جہاں آرا کو بادشاہ بیگم کا خطاب دیا۔ جہاں آرا کی ہی کوششوں سے داراشکوہ کی بیٹی جہاں زیب بانو کی شادی اورنگ زیب عالم گیر کے تیسرے بیٹے محمد اعظم سے ہوئی۔ جہاں آرا اب بھی بھائیوں اور ان کے درمیان چل رہی خاندانی دشمنی کو دور کرنے کی کوشش میں تھی۔ جہاں آرا چاہتی تھی کہ بھائیوں کی آپسی دشمنی ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے۔

جہاں آرا کی قربانیاں بے شمار ہیں۔ یہ شہزادی صبر، استقلال، ہمت وشجاعت کا عظیم پیکر تھی۔ سیاسی اور معاشی طور پر اس قدر طاقتور ہونے کے باوجود بھی جہاں آرا نے کبھی شریعت کو اپنے ہاتھ جانے نہ دیا۔ بہن بھائی کے علاوہ شائد

مضامین

www.urduacademyts.com

ہی کوئی ایسا مرد ہوگا جو جہاں آرا کو بے نقاب دیکھا ہوگا۔ مورخوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ جہاں آرا کو نقاب میں بھی شائد ہی کسی غیر محرم نے دیکھا ہوگا۔ جہاں آرا کی پردہ نشینی سے متعلق ایک اہم واقعہ ضیاالدین برنی لکھتے ہیں:

اپریل 1644ء کو جب شاہزادی شہنشاہ سے ملاقات کر کے واپس آرہی تھی تو یکا یک اس کے آنچل میں کسی ایک موم بتی سے آگ لگ گئی جو راستہ کی روشنی کے لئے رکھی ہوئی تھی۔ اگر چہ چاروں خادماوں نے جو ہمراہ تھیں آگ بجھانے میں خود کو بھی جلالیا اور ایک غریب تو بالآخر انتقال ہی کر گئی۔ تاہم وہ شہزادی کو آگ کے تباہ کن اثرات سے بچانے میں بالکل ناکام رہی۔ اس لئے کہ جہاں آرا کے کپڑے نہایت باریک ململ کے تھے۔ اور ان میں جہانگیری عطریات اور خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آن کی آن شہزادی کا سارا جسم شعلوں سے ڈھک گیا۔ اس سے بیشتر کے امداد پہنچے اور آگ پر پورا قابو حاصل کیا جائے شہزادی خوفناک طریقہ سے جل چکی تھی۔ اس کی پشت، دونوں پسلیاں اور باہیں بہت زیادہ جل گئی تھیں۔ بادشاہ نے فرطِ غم میں دربار بھی منعقد نہیں کیا بلکہ خیرات کرنے، دعائیں مانگنے اور قیدیوں کو رہا کرنے کے متعلق فرامین جاری کر دیئے۔ پندرہ ہزار اشرفیاں اور تقریباً اسی قدر روپے تین دن کے اندر غربا میں تقسیم ہو گئے۔ لیکن شہزادی اچھی نہ ہوئی۔ بلکہ حالت بگڑتی ہی گئی۔ شہنشاہ خود اپنے ہاتھ سے مرہم لگاتا اور اپنے ہاتھ سے اسے غذا کھلاتا تھا۔ علاج معالجہ آٹھ نو ماہ تک جاری رہا۔

(جہاں آرا: ضیاالدین احمد برنی، صفحہ : ۱۴)

مولوی محبوب الرحمٰن لکھتے ہیں کہ جہاں آرا نے شرم وحیا کے پاس ولحاظ سے آواز تک نہیں نکالی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مرد سپاہی اس کی مدد کو آئے اور اس کا لباس دیکھے۔ اس واقعہ سے جہاں آرا کی پردہ نشینی اور تقوی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں آرا کس حد متقی پرہیز گار تھی۔

بعض اوقات جہاں آرا بیگم ایک بلند اور خوبصورت ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتی تھی لیکن پردہ کی سخت پابند تھی۔ اس کے علاوہ شاہجہاں کے ساتھ متعدد بار دکن، پنجاب، کشمیر اور کابل کی سیر کی لیکن ہر حالت اور ہر موقع پر پردے کا پورا خیال کیا۔

(جہاں آرا: مولوی محبوب الرحمٰن، صفحہ ۲۵، اشاعت ۱۹۰۶)

یہ بات اس لئے بھی کہنی ضروری ہے کہ یوروپی مورخوں نے جہاں آرا کی پاک دامنی پر انگلی اٹھانے اور حرم میں رہنے والی خواتین کو بدنام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان میں برنیر، منوچی، اور ٹیورنیر پیش پیش ہیں۔ مولوی محبوب الرحمٰن نے اپنی کتاب میں برنیر کے سفرنامہ کا ایک اقتباس لکھا ہے جو کچھ اسطرح ہے:

ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے اگر چہ بیگم صاحبہ محل میں حسب معمول محصور رہتی تھی اور محل کی مستورات کی طرح اس کی بھی نگہبانی ہوتی تھی۔ مگر کسی مخفی طور پر اس کے پاس ایک نوجوان کی آمد ورفت ہوگئی۔ جو اگر چہ کوئی خاندانی آدمی نہ تھا مگر حسین بہت تھا۔ اور اس کا ہر وقت محافظوں سے مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔ تو یہ راز کس طرح نہ کھل جاتا۔ الغرض شاہجہاں بھی بیگم صاحبہ کی

www.urduacademyts.com

خطا ولغزش سے واقف ہوگیا۔اور یہ ارادہ کر کے کہ خلاف معمول محل میں جا کر اس ماجرے کو دریافت کرنا چاہیے۔ ناگہاں وہاں چلا گیا اب چونکہ بیگم صاحبہ کو بادشاہ کے آنے کی خبر جلد ہی نہ مل سکی کہ اس شخص کو مناسب جگہ پر چھپا سکے۔اس لئے اس خوف زدہ عاشق نوجوان کو حمام کی ایک بڑی دیگ میں چھپنا پڑا۔اس امر کے ملاحظہ سے بادشاہ کے چہرے پر نہ تو کچھ تعجب ہی کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ کچھ غصہ و ناخوشی ہی معلوم ہوئی بلکہ بیٹی سے معمولی باتیں کرتا رہا لیکن کسی قدر بات چیت کے بعد کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ تم نے آج حسب معمول غسل نہیں کیا۔حمام کرنا چاہیے۔''اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ دیگ کے تلے آگ جلائیں اور جب تک انہوں نے یہ نہ جتلا دیا کہ وہ قسمت کا مارا جل کر خاک ہوگیا ہے وہاں سے نہ ہلا۔(جہاں آرا' مولوی محبوب الرحمٰن' صفحہ ۳۱' اشاعت ۱۹۰۶)

برنیر کی مندرجہ بالا لفاظی مغلیہ حکومت سے بغض، حسد اور جہاں آرا سے حد درجہ جلن کو واضح کرتی ہے۔یہ واقعہ اس لئے فرضی ہے کیونکہ محل میں کسی انجان مرد کا داخل ہونا ناممکن تھا اور اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ کوئی اجنبی داخل بھی ہوا ہو تو اس کی رسائی شہزادیوں کے محل تک ہونا ناممکن تھی۔ مصنف مولوی محبوب الرحمٰن نے برنیر کے ہی لکھے الفاظ کو اپنی کتاب ''جہاں آرا'' میں پیش کیا ہے ملاحظہ ہو:

''مغلیہ کی تمام بیگمات حد درجہ پردہ نشین تھیں۔ مجال ہے کہ کوئی ان بیگمات کے نزدیک جاسکے۔قریب قریب ناممکن ہے کہ وہ انسان کو نظر آئیں۔سوائے اس سوار کے جو اتفاق سے ان بیگمات کی سواری کے نزدیک جا نکلے۔کیونکہ وہ شخص کیسا ہی ذی رتبہ کیوں نہ ہو۔خواجہ سراوں، خواصوں کے ہاتھوں پٹے بغیر نہیں رہ سکتا یہ لوگ ایسے موقع پر بڑے شوق سے اس کی خوب گت بناتے ہیں۔'' (جہاں آرا' مولوی محبوب الرحمٰن' صفحہ ۲۵ تا ۲۶)

برنیر کے بیان میں ہی حد درجہ تضات پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف مغل شہزادیوں کی شرافت، پردہ داری کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا تو دوسری طرف جہاں آرا کی عاشقی کی فرضی داستان بھی بیان کرتا ہے۔یہ تب ممکن تھا جب کوئی غیر مرد شہزادی کے حرم کی طرف قدم بڑھا تھا۔قلعہ میں جہاں شہزادیوں کا گزر ہوتا ہو یا پھر ان کے محلات موجود ہوں وہاں پر کسی مغل زادے کا گزر بھی انتہائی مشکل تھا۔ برنیر اور دوسرے یوروپی مورخین جہاں آرا کی شادی سے متعلق من گھڑت کہانیاں بیان کرتے ہیں۔جبکہ حقیقت یہی ہے کہ مغل دور میں کئی ایسی شہزادیاں گزری ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوئی۔اکبر کے زمانے سے ہی مغل زادیوں کی شادیوں کے واقعات کا ذکر نہیں ملتا۔تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ شائد اس کی ایک اہم وجہ مغل شہزادیوں کو ان کے اعلیٰ مرتبہ اور رتبہ کے مطابق رشتہ کا نہ ملنا ہوسکتا ہے۔جہاں آرا نے کبھی شادی نہیں کی۔اپنی پوری عمر مغلیہ سلطنت کی فرماں برداری، اس کی ترقی وترویج، فلاح و بہبود میں صرف کردی۔ضیاالدین احمد برنی نے اپنی کتاب ''جہاں آرا'' میں لکھا ہے کہ جہاں آرا

www.urduacademyts.com

خالی اوقات میں تلاوت قرآن کریم میں مصروف رہتی اور صوفیا اکرام کے ملفوظات سے فیض اٹھاتی۔

آخر کار ستر سال کی عمر میں مغلیہ سلطنت کا ایک بیش قیمتی اساسہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

3 رمضان 1092ء ہجری مطابق 16 اپریل 1681ء کو ستر برس کی عمر میں جہاں آرا نے وفات پائی اور دہلی میں حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے قریب دفن ہوئی۔ (جہاں آرا، ضیاالدین احمد برنی، صفحہ:۲۷)

جہاں آرا کی موت مغلیہ سلطنت کے لئے گرہن تھا۔

یہ وہ شہزادی تھی جس نے بچپن سے لے کر آخری وقت تک مغل سلطنت کی ترقی کے لئے ہر ممکن کام کئے۔ اس نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کون تخت شاہی پر بیٹھا ہے۔ اس نے شاہجہاں کا بھی ساتھ دیا، اپنے بھائی داراشکوہ کو بھی حوصلہ دیا اور اورنگ زیب کو بھی مفید مشورے دیئے۔ جہاں آرا نے کسی فرد واحد یا کسی حمایتی کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اس کی زندگی مغلیہ سلطنت کی ترقی کا ایک اہم جز ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عبدالمغنی صدیقی

صدر شعبہ اردو، انوار العلوم کالج، حیدرآباد

موبائل : 9290745279

مسعودہ حیات

ہم ہند کے شیدائی

اس دیس کی وادی میں ہر پھول مہکتا ہے
ہر قوم کے رہبر کا کردار لہکتا ہے
اپنا ہو کہ بیگانہ بلبل سا چہکتا ہے
ہر مذہب و ملت نے بھارت میں اماں پائی
ہم ہند کے رکھوالے ہم ہند کے شیدائی

اک امن و محبت کی تفسیر ہے یہ گلشن
ایثار و اخوت کی تصویر ہے یہ گلشن
تعمیر و ترقی کی تنویر ہے یہ گلشن
ہر گوشۂ بھارت ہے خود اپنا تماشائی
ہم ہند کے رکھوالے ہم ہند کے شیدائی

ہر فرد کو جینے کا انداز سکھادیں گے
کیا شے ہے رواداری دنیا کو دکھا دیں گے
ہر نسل کے انساں کو ہم ایک بنادیں گے
سورج کی کرن اب تو بادل سے نکل آئی
ہم ہند کے رکھوالے ہم ہند کے شیدائی

www.urduacademyts.com

رئیس المتغزلین جگرؔ مرادآبادی کی شاعری

بیسویں صدی کے ایون غزل کے اہم ستونوں میں رئیس المتغزلین جگرؔ مرادآبادی کا شمار ہوتا ہے، جنہیں شہنشاہ تغزل بھی کہا جاتا ہے۔ اردو غزل اور اس کی کلاسیکی روایات کو زندہ رکھنے اور اسے ترقی پذیر بنانے میں حسرتؔ موہانی، فانیؔ بدایونی، اصغرؔ گونڈوی کے ساتھ ساتھ جگرؔ مرادآبادی کا بہت بڑا حصہ رہا۔ یہی اردو غزل کے وہ چار پائیدار ستون ہے جن پر جدید غزل کی خوبصورت عمارت قائم ہے۔

علی سکندر جگرؔ مرادآبادی کی پیدائش ۶/ اپریل ۱۸۹۰ کو مرادآباد یوپی میں ہوئی۔ جگرؔ مرادآبادی جس گھرانے میں پیدا ہوئے اس گھرانے کا اوڑھنا بچھونا شاعری رہا۔ علی سکندر جگرؔ مرادآبادی کے والد محمد علی نظر اور ان کے دادا حافظ امجد علی اور ان کے پردادا حافظ نور محمد سب اپنے زمانے کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ اس طرح جگرؔ مرادآبادی کو شاعری ورثہ میں ملی۔ بقول جگرؔ اپنے دادا کا شعر جو انہیں بے حد پسند رہا:

لطف جاناں رفتہ رفتہ آفت جاں ہو گیا
ابر رحمت اس طرح برسا کہ طوفان ہو گیا

اور اپنے والد کے اس شعر کو بہت زیادہ پسند فرماتے ہیں:

وہ یہاں آئے ہم وہاں پہونچے
ان کو شکوہ ہمیں گلہ نہ رہا

جگرؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ شعر گوئی کریں۔ وہ ابتدائی شباب سے ہی شعر گوئی اور شراب نوشی کرنے لگے۔ شاعری میں اپنے والد سے اصلاح لیتے رہے اور بعد میں داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی، اور امیر اللہ تسلیم سے بھی اپنی غزلوں پر اصلاح لی۔

جگرؔ کے ابتدائی کلام میں شراب و شباب، رندو مستی کی مدہوشی نظر آتی ہے حسن و عشق کی سرشاری نظر آتی ہے۔ جگرؔ شاعری ایسی کرتے کے عشق و محبت کا سچا آئینہ نظر آتا اور سوز و گداز، کیف و مستی کی کیفیت ان کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ جگرؔ فرماتے ہیں:

اگر نہ زہرہ جبینوں کے درمیاں گزرے
تو پھر یہ کیسے کٹے زندگی کہاں گزرے

جگر کے مزاج میں شگفتگی اور رنگینی ملتی ہے اور شراب نوشی اتنی کرتے کہ مشاعرے کے بعد لوگ انھیں اٹھا کر گھر لاتے۔ شاعری اور شراب نوشی جگرؔ کی زندگی کا لازمی جز تھا۔ بقول جگرؔ:

سب کو مارا جگرؔ کے شعروں نے
اور جگرؔ کو شراب نے مارا
پینے کو تو بے حساب پی لی
اب ہے روز حساب کا دھڑکا

جگرؔ اپنے ابتدائی دور کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ”میری شاعری غزل ہی تک محدود ہے اور چونکہ حسن و عشق میں میری زندگی ہے اور بعض مستثنیات کو چھوڑ کر

www.urduacademyts.com

کبھی دوسرے میدان میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کر سکا''۔

جگرؔ اپنے شعروادب پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی زندگی اوران کی شاعری میں بالکل مطابقت ہے تضاد نہیں۔

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگرؔ
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

جگرؔ اپنے عہد شباب میں ازحد بادہ نوشی کی لت کی وجہ سے پرسکون ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکے۔پہلی بیوی وحیدن بیگم جلد ہی داغ مفارقت دے گئیں،اور دوسری ازدواجی زندگی بھی زیادہ عرصہ تک نبھ نہیں سکی۔جگرؔ کی کثرت بادہ نوشی کی لت، بے پرواہیوں اور بے احتیاطیوں کی بدولت ان کی جوانی میں ازدواجی خوشیاں نصیب نہیں ہوئیں،لیکن زندگی کے آخری عرصہ میں ازدواجی زندگی سے منسلک ہوگئے۔اس بات کا جگرؔ کو تاعمر صدمہ رہا۔اپنی شاعری میں اپنے اس درد کو یوں پیش کیا کہ:

تم مجھ سے چھوٹ کر رہے سب کی نگاہ میں
میں تم سے چھوٹ کر کسی قابل نہیں رہا

جگرؔ اپنی ذاتی زندگی کا نوحہ کچھ یوں رقم کرتے ہیں کہ:

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

جگرؔ کی زندگی میں اصغر گونڈوی کا بہت اثر رہا۔جگرؔ کی ملاقات حضرت اصغرؔ سے ۱۹۱۹ء میں ہوئی،اصغرؔ کا اثر جگرؔ پر اتنا گہرا ہوا کہ وہ ان کے دل ودماغ پر چھا گئے۔وہ جگرؔ کے مربی اور ذہنی پیشوا بن گئے جگرؔ کہتے ہیں:

حریم حسنِ معنی ہے جگرؔ کاشانۂ اصغرؔ
جو بیٹھو، با ادب ہو کر ،تو اٹھو،با خبر ہو کر
یوں تو ہونے کو جگرؔ اور ہیں اہلِ کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھ کو

یہاں تک کہ اصغرؔ گونڈوی نے اپنی سالی نسیمؔ سے جگرؔ کا دوسرا نکاح بھی کروایا۔قسمت کی ستم ظریفی دیکھیں کہ یہ نکاح بھی نبھ نہیں پایا۔اور بعدِ طلاق جگرؔ کی دوسری اہلیہ اصغرؔ گونڈوی کی زوجیت میں آگئیں اور پھر کچھ ہی وقت بعد اصغرؔ داغ مفارقت دے گئے۔جگرؔ نے دوبارہ سے نسیمؔ سے نکاح کر کے انہیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔یوں تو جگرؔ طبعاً حسن وعشق کے شاعر واقع ہوئے لیکن ان کی ازدواجی زندگی کے واقعات وحادثات نے انہیں از حد رومانی بھی بنا دیا۔ جگرؔ محبت کے شاعر ہیں۔جگرؔ کا مزاج عاشقانہ اور حسن وعشق ہی ان کی دنیا رہی۔جگرؔ نے ساری زندگی حسن وعشق کے نغمے گائیں۔آل احمد سرور رقم طراز ہیں کہ:

''انہوں نے زندگی اور حسن کو جیسا پایا ہے بے نقاب کیا۔جگرؔ کی عشقیہ شاعری میں گہرائی اور حقیقت نظر آتی ہے۔اس کی وجہ سے رومانیت وقیع ہوگئی اور ان کا ادبی مرتبہ مستحکم''۔(آتش گل۔دیباچہ)

جگرؔ نے صنف غزل کو اپنایا اور اسی صنف میں اپنا لوہا منوایا۔جگرؔ کی انداز شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کی فکر شعر میں شراب کی سرمستیاں چھائی ہوئی ہیں۔جگرؔ کی شرر نگار اور خمریہ شاعری کا تجزیہ کیا جائے تو ایک

www.urduacademyts.com

دفتر درکار ہے۔مثال کے طور پر ان کے ابتدائی مجموعہ کلام ''داغ جگر'' کے کئی اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

ساقیا، توبہ کئے لیتے ہیں
لے گنہگار ہوئے جاتے ہیں

جگر نے ایک عرصہ بعد شراب ترک کر دی اور مولانا تھانوی کے ہاتھ پر بیعت کی اور راہ راست زندگی گزارنے کی ٹھانی۔جب جگر نے شراب سے توبہ کر لی تب بھی شراب کا تذکرہ ان کا محبوب موضوع رہا۔لیکن بدلے ہوئے تصور کے ساتھ اب یہ شراب ''شراب معرفت'' بن گئی۔ اس موڑ پر جگر فرماتے ہیں:

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھینچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوالیتی ہے مانی نہیں جاتی

یہاں حیات جگر سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''آہ جب اللہ تعالی ہدایت کا دروازہ کھولتا ہے تو جگر جیسا شرابی توبہ کرتا ہے۔اتنا پیتا تھا یہ شخص کہ دو آدمی اٹھا کر اس کو مشاعرہ میں لے جاتے تھے،مگر ظالم کی آواز ایسی غضب کی تھی کہ مشاعرہ ہاتھ میں لے لیتا تھا۔جیسا وہ خود کہتے ہیں کہ:

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

بیعت کے بعد جگر نے شراب چھوڑ دی ،کثرت شراب نوشی کی عادت تھی؛ بالکل شراب ترک کرنے کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئے۔جگر اور معدہ میں سوزش ہوگئی۔قلب میں درد رہنے لگا،ان کے جسم کی جلد پھٹنے لگی۔ڈاکٹروں نے ان کی حالت دیکھتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ کم مقدار میں شراب پیتے رہیں تا کہ ان کا جسم جس شراب کا عادی تھا دھیرے دھیرے تاب لا سکے۔یہاں جگر نے ڈاکٹروں سے پوچھا بغیر شراب جسم کے اعضاء کب تک کام کر سکتے ہیں۔پتہ چلا کہ بمشکل چند سال۔جگر نے فیصلہ کیا کہ چند سال خدا کے غضب کے ساتھ زندہ رہوں،اس سے اچھا ہے عارضی تکلیف اٹھا کر خدا کی رحمت کے سائے میں مر جاؤں۔انہوں نے اپنی بیعت کی لاج رکھی اور شراب بالکل چھوڑ دی۔بقول جگر:

چلو دیکھ آئیں جگر کا تماشا
سنا ہے وہ کافر مسلمان ہوگا

جگر اپنی ماضی کی حرکتوں اور غلطیوں پر شرمسار ہیں،احساس ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے اپنی خطاوں کی معافی طلب کرتے ہوئے راہ حق کا راستہ اختیار کیا۔خدا واحد کی وحدانیت میں غرق ہونے کا عہد کیا تو ان کے کلام میں پاکیزگی اور روحانیت جھلکنے لگی،اور اس موپر ڑ پر جگر فرماتے ہیں کہ:

جنون سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا

ترنم سے شعر پڑھنا،سامعین کی داد وتحسین اور مکرر ارشاد کے ہنگاموں سے محفل مشاعرہ کو لوٹ لینا جگر کی خاصیت ہے۔ان کی شاعری میں گہرائی اور حقیقت ملتی ہے،جگر لفظوں کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں،ان کی طرز تحریر میں بلا کی شگفتگی و شستگی موجود ہے،روانی سے خیالات وتجربات کی ترسیل کرتے ہیں،ان کے کلام میں

www.urduacademyts.com

تغزل کی تاثیر ملتی ہے۔جگرؔ کی شعر خوانی کا نرالا انداز ہے،موسیقیت نغمہ ریزی اور دل کومحوکر جانے والی ان کی انفرادیت ہے۔ ان کی شاعری کی رومانیت میں بھی روحانیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ان کے مجاز میں حقیقت کا عکس نمایاں ہے۔ بقول جگرؔ:

نمودِ صبحِ کاذب ہی دلیل صبحِ صادق ہے
اُفق سے زندگی کی دیکھ وہ اُبھری کرن ساقی

بقول عرش ملسیانی جگرؔ کی شاعری میں جذبہء صادق،اعتراف گنہہ،تیقن عشق،احترام محبوب سے والہانہ پن ملتا ہے۔حسن وعشق ہی ان کی دنیا رہی اور رندومستی ان کا سرمایہ زندگی رہا۔جگرؔ ایک حساس دل اور متوازن طبعیت رکھتے تھے۔انہوں نے زمانوں کے تقاضوں کوحسن وعشق کے تقاضوں کے ساتھ محسوس کیااورانھیں شعری جامہ پہنایا۔رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں ''جگرؔ میں بے پایاں سرشاری اور سپردگی کے ساتھ عشق اوراس کے متعلقات کا جواحساس یا بصیرت ملتی ہے وہ ان کی شخصیت کو بہت دل آمیز ومحترم بنا دیتی ہے''۔جگرؔ فرماتے ہیں:

مرا ذوق بھی مرا شوق بھی ہے بلند سطح عوام سے
ترا ہجر بھی ترا وصل بھی مرے درد دل کی دوا نہیں

یہ سچ ہے کہ حیات جگرؔ کا بیشتر حصہ رندی ومستی میں گذرا،مگرتاثیر کلام کی پاکیزگی اپنی جگہ برقرار ہے۔اور یہی وصف خاص ان کو دیگر شعراء کے کلام میں منفرد کرتا ہے۔جگرؔ کی سادگیء مئے کشی کی انتہا تو دیکھئے کس سادگی ومعصومیت سے وہ فرماتے ہیں:

اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال
درپردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

جگرؔ کے اشعار میں عشق کا جو تصور ملتا ہے وہ ان کے ذاتی احساسات اور تجربہ پر مبنی ہے شاید اسی لئے ان کے اشعار میں تاثیر اور جگر کاٹنے کی کیفیت ملتی ہے۔جگرؔ عشق راہ پر خار پر چلتے رہے اوراس راہ دشوار گذار کی وجہ جو آبلے پڑے اس کا اندازہ انہیں بہ خوبی تھا۔جگرؔ نے اپنے اس تجربہ کوشعر کی صورت میں یوں ڈھالا کہ:

یہ عشق نہیں آسان بس اتنا سمجھ لیجئے
ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جگر کا محبوب کوئی خیالی یا فرضی نہیں ہے بلکہ حقیقی ہے اور وہ حقیقت میں اس کے ہجر وفراق میں تڑپتے ہیں۔ان کے عشقیہ اشعار محض فرضی داستانیں نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے وہ ذاتی تجربات ہیں جو وہ ان مراحل سے گذر کر کہے ہیں جس کے طفیل جگرؔ ایسے شعر کہنے پر قادر ہوئے۔

محبت عین مجبوری ہی سہی لیکن یہ کیا واعظ
مجھے باور نہیں آتا میرا مجبور ہوجانا

یا پھر یہ شعر:

وفا کا نام کوئی بھول کر نہیں لیتا
تیرے سلوک نے چونکا دیا زمانے کو

www.urduacademyts.com

جگرؔ محبت کو فیضان الٰہی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں:

اللہ اگر توفیق نہ دے تو انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

جگرؔ اپنی خوش بیانی کے باعث بہتوں پر بازی لے گئے، ان کی شاعری نہایت ہی خوش آہنگ اور مترنم ہیں، ان کے نزدیک حاصل کائنات اور حقیقت کائنات محض حسن ہے، ان کی غزلیں استعارات وتشبیہات اور تغزل سے بھرپور ہیں۔ جگرؔ کے کلام میں زندگی کا احترام، آدمیت کی قدر اور حسن کی سرشاری ومستی سے مملو ہیں۔ جگرؔ اپنے کمال فن کا سبب اپنی محبت اور محبوب کو ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں:

میر اکمال شعر بس اتنا ہے اے جگرؔ
وہ مجھ پہ چھا گئے، میں زمانہ پہ چھا گیا

جگرؔ کا یہ دعوی ایک حقیقت بن گیا اور وہ غزل کے شاعر کی حیثیت سے اپنے فن شعر سے نہ صرف خود تڑپتے رہے بلکہ ہر سننے والے کو تڑپاتے رہے۔ جگرؔ کے کلام میں سوز و گداز، سرمستی وشادمانی کی کیفیات ملتی ہیں۔ لیکن جگرؔ نے اس کے اظہار میں توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جگرؔ کو گر کچھ یاد رہا تو وہ صرف محبت رہی۔ فرماتے ہیں:

دنیا کہ ستم یاد نا اپنی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

جگرؔ کے غم عشق میں ایک عجیب وغریب کیفیت ملتی ہے جو بہت لطیف ہوتے ہوئے بھی مسرت کو اپنائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے غم یار کو اپنی ذات کے لئے ناگزیر بنالیا اور کہتے ہیں:

میں رہین درد سہی مگر مجھے اور چاہئے کیا جگرؔ
غم یار ہے مرا شیفتہ میں فریفتہ غم یار پر

جگرؔ نے محبت کو کبھی یکطرفہ نہیں جانا وہ اس بات کے قائل رہے کہ دونوں طرف آگ برابر لگی رہی اور وہ اپنے محبوب کو اپنے عشق سے اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی محبت کے ساتھ ان کے جذبوں کا جواب دیں، چاہنے اور چاہے جانے کی کیفیت سچی محبت اور سچے عاشق کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ جگرؔ نے ان کیفیات کو یوں ظاہر کیا ہے کہ:

ارض نیاز عشق کا چاہئے کیا اور صلہ
میں نے کہا بہ چشم نم اس نے سنا بہ چشم تر

ایک اور مقام پر جگرؔ کہتے ہیں

جہاں وہ ہے وہیں میرا تصور
جہاں میں ہوں خیال یار بھی ہے

جگرؔ کے کلام کی اصل پہچان غزل میں تغزل، کلام میں سوز وگداز، شعر خوانی میں موسقیت، ترنم نغمہ ریزی رچی بسی ہے، ان کے کلام کے دو اہم پہلو ایک شراب وشباب کی رند ومستی ہے تو دوسرا اہم رخ عشق حقیقی سے سرشاری ہے۔ ابتدائی کلام میں شراب شباب رندومستی حسن وعشق میں پھنسے رہے، لیکن جب وقت نے کروٹ لی اور ملک کے حالات بدلے ہنگامے برپا ہوئے، قیامت خیز تباہی ہوئی، ملک تقسیم ہوا، ہجرت کا سانحہ ہوا، خون ریزی ہوئی، قتل و غارت گری ہوئی اور تڑپتی انسانیت کو دیکھا، ملک کی تہذیب

www.urduacademyts.com

کودم توڑتے دیکھا تو جگر کو کافی صدمہ ہوااور وہ اندر سے ٹوٹ کررہ گئے۔ان کے تڑپتے دل کی پکار بن ان کی شاعری سے آتش گل نمودار ہوئی۔ان حالات میں جگر پر جو ذہنی انقلابی تغیر نمودار ہوا وہ آتش گل کے نام سے تیسرا مجموعہ کلام منصۂ شہود پر آیا جو انسانیت سے حد درجہ محبت کی دلیل ہے۔جگر دعا گو ہے کہ:

خدا کرے نہ پھر آنکھوں سے یہ سماں گذرے

جگر نے اپنی غزلیات میں غزل مسلسل کا رنگ پیدا کیا جن کی نمائندہ غزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

جب نگاہ اٹھ گئی اللہ رے معراج شوق
دیکھتا کیا ہوں کہ وہ جان بہار آہی گیا

اس غزل کا مقطع جگر کی شاعرانہ تغزل اور محاکات کا نمائندہ ہے:

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا

جگر نے اپنی غزل مسلسل میں وہ حرکیاتی کیفیت پیدا کی ہے جس کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہورہا ہے:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جارہے ہیں
شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے نظر میں مستی ابل رہی ہے
جھلک رہی ہے اچھل رہی ہے پئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

جگر کا کمال یہ ہے کہ ان کی شاعری میں خشک موضوعات نہیں ملتے۔وہ ہر حال میں بے خودی کے نغمے گاتے ہیں جس میں حسن وعشق کے قصے ضرور ہوتے ہیں اور جو فکر شاعر میں اسے اس مقام تک ضرور پہنچادیتے ہیں جہاں عشق حقیقی کا رنگ ملتا ہے۔یوں تو جگر نے حسن وعشق اور تصور محبوب کے موضوعات کو اپنی غزل میں شامل کیا،اس نازک وقت میں جب کہ غزل کو کمتر درجہ دیا جارہا تھا۔انہوں نے غزل کے وقار کو بلند کیا بلکہ غزل میں تغزل بھر کر اسے جان شعر (روح شعر) بنا دیا۔جگر کی غزلوں میں الفاظ نرم اور رواں ہوتے ہیں جس سے خود بہ خود موسیقی پیدا ہوتی ہے۔مثلاً:

جب مسرت قریب آئی ہے
غم نے کیا کیا ہنسی اڑائی ہے

جگر اپنے فن شعر میں الفاظ اور محاورے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔جذبات کے تیز بہاؤ کے ساتھ الفاظ ومحاورے کے برجستہ استعمال نے ان کے کلام کو پرکشش بنا دیا ہے۔ان کی شاعری صرف غم جاناں تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک حساس شاعر اور سماج کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے انہوں نے ملک کی مختلف مصیبتوں کا ذکر کیا ہے گو کہ وہ بنیادی طور پر سیاسی شاعر نہیں ہے بلکہ ان کا یہ دعوی ہے کہ وہ محبت کے بندے ہے اور محبت کا پیغام دینا ہی ان کا فرض عین ہے اسی لئے اہل سیاست کو مخاطب کر کے کہتے ہے کہ:

ان کا جو فرض ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

www.urduacademyts.com

قحط بنگال پر جگرؔ تڑپ اٹھے اور کہنے لگے کہ:

بچوں کا تڑپنا و بلکنا و سسکنا
ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

ہندوستان میں جب اعلان جمہوریت ہوا تو جگرؔ نے لکھا کہ:

خدا کرے یہ دستور ساز گار رہے
جو بے قرار ہے اب تک انہیں قرار آیا

۱۹۴۱ سے لے کر ۱۹۵۷ کے کلام جگرؔ میں ایک عظیم انقلابی تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شخصیت پہلے سے زیادہ محبوب، دلآویز و محسور کن بن چکی تھی۔ ان کا کلام پہلے سے زیادہ نکھرا ہوا ملتا ہے۔ وہ جذبہء روحانیت سے لبریز اور عشق حقیقی سے سرشار نظر آتے ہیں۔، اور ان کے کلام میں ہر سو خدا کی قدرت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

خدا وہ درد محبت ہر ایک کو بخشا
کہ جس میں روح کی تسکین پائی جاتی ہے
آسان نہیں معاملۂ جلوہ و نظر
چشمِ کلیم چاہئے دیدار کیلئے

اس فانی زندگی کی حقیقت کے اسرار و رموز کو جگرؔ سمجھنے لگے تو یہ کہنے پر قادر ہوئے کہ:

ہستی کے نکات پوچھتا ہے
غافل تجھے اپنی بھی خبر ہے
قیودِ دو عالم سے آزاد ہوکر
حدود محبت بڑھاتا چلا جا

جگرؔ نے اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شاعری کی ہے جگرؔ کے تین اردو مجموعہ کلام ہیں۔ داغ جگر ۱۹۲۲، شعلہ طور ۱۹۳۲، آتش گل ۱۹۵۸ میں منظر عام پر آیا۔ جگرؔ نے اپنے زندگی کے آخری دہے میں اپنے شائع شدہ مجموعوں میں کچھ اصلاح کی۔ مجموعہ شعلہ طور (دور اول تا دور چہارم) کی نظر ثانی کر کے دوبارہ شائع کروایا۔ اس سلسلہ میں اس مجموعہ کے ناشر ''حرف ناشر'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''۱۲۱۴ اشعار اس مجموعہ سے حذف کئے گئے۔ ۱۱۴۳ اشعار میں ترمیم کی گئی۔ ۱۷ نئے اشعار شامل کئے گئے اور کئی ایک اغلاط درست کی گئیں۔''

جگرؔ کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو گونڈہ لکھنو میں دل کا شدید دورہ پڑنے کی وجہ سے ہوا۔

جگرؔ کو پدم بھوشن خطاب ملا ان کی زندگی میں ہی انہیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا گیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں نے جگرؔ کے نام پر جگر میموریل انٹر کالج اور ایک کالونی جگر گنج کے نام سے منسوب کی۔ بقول جگرؔ

دل کو سکون روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ یار کا پیغام آگیا

☆☆☆

ڈاکٹر شاہانہ مریم شان
63-B، پہلی منزل، نزد U بلاک، شکر پور خاص
دہلی۔ 110092
موبائل: 09650677959

www.urduacademyts.com

ڈاکٹر سید محی الدین زورؔ کی لسانی تنقیدی خدمات

اُردو تنقید کے باب میں حیدرآباد کے ناقدین کی لسانیاتی تنقیدی خدمات چند ہی نقادوں کے ہاں ملتی ہیں۔ اگر چہ گنے چنے ناقدین نے ہی لسانیاتی تنقید کی طرف توجہ کی ہے مگران کی تنقیدی خدمات قابل قدر اور اردو تنقید کی دنیا میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان ناقدین میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے لسانیات پر جامع اور مستند کام کیا ہے۔ لسانیات کے حوالے سے ان کی مشہور کتاب ''ہندوستانی لسانیات'' بہت اہم ہے۔ یہ کتاب انہوں نے پہلے (HINDUSTANI PHONETICS) کے نام سے پہلے ۱۹۳۰ء شائع کی تھی۔ اس کتاب کے علاوہ ڈاکٹر زورؔ نے لسانیات پر کئی مضامین لکھے جن میں لسانیاتی تنقید اور لسانیات کے نئے اصول اور نئی اصطلاحیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ کے علاوہ پروفیسر مغنی تبسم نے بھی لسانیاتی تنقیدی خدمات انجام دی ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کے ساتھ ساتھ پروفیسر حبیب ضیاء نے بھی لسانی تنقید کے میدان میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر اشرف رفیع نے پروفیسر مغنی تبسم سے متاثر ہوکر چند لسانیاتی تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے باضابطہ طور سے لسانیات پر اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے لسانیات پر بہترین اور مفید کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے مضمون ''لسانیات'' میں لسانیات کی جامع تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لسانیات اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے زبان کی ماہیت، تشکیل، ارتقا، زندگی اور موت کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کائنات اور معاشرت انسانی سے متعلقہ علوم میں لسانیات کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا احساس ابھی ابھی پیدا ہوا ہے۔ فرانس کا مشہور فاضل ای۔ گوبلو پہلا شخص ہے جس نے کتاب ''تقسیم علوم'' (مؤلف ۱۹۹۸ء) میں اس علم کی کماحقہ تعریف اور اہمیت پر بحث شروع کی اور اس وقت سے آج تک اس علم کے مقاصد وفوائد اور اصول وضوابط کی نسبت متعدد کتابیں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔'' [1]

(مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، جلد اول، مرتب، سید رفیع الدین قادری، ۲۰۰۸ء، ص ۵۱۹)

لسانیات اس علم کا نام ہے جس میں زبان کی ماہیئت، تشکیل، ارتقاء، زندگی اور موت کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کائنات اور معاشرت انسانی سے متعلق علوم میں لسانیات کو جو اہمیت حاصل ہے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ فرانس کا مشہور فاضل ای۔ گوبلو پہلا شخص ہے جس نے کتاب ''تقسیم علوم'' ۱۹۹۸ء میں اس علم کی تعریف اور اہمیت پر

www.urduacademyts.com

وضاحت شروع کی۔اس زمانے سے آج تک اس علم کے مقاصد ،فوائد، اصول وضوابط کی نسبت سے کئی کتابیں بیشتر ملکوں کی ترقی یافتہ زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔اس کتاب سے لسانیات کے تمام طالب علم استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

دکنی زبان کا اثر شمالی ہند پر کس طرح پڑھا اس حوالے سے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اپنے مضمون ''دکنی کا اثر شمالی ہند پر'' پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب کی فتح دکن کے بعد جب کچھ عرصے کے لیے شمال اور دکن میں ملاپ اور دکن کے لوگ شمال اور شمال کے دکن آنے جانے لگے تو دونوں کو اپنی زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا' لیکن چوں کہ دکن والوں نے اس میں خاصہ ادبی کام کیا تھا ،شمال والوں نے معلوم کیا کہ ہم اس بارے میں دکن سے بہت پیچھے ہیں۔وہاں کسی شخص نے بول چال کی زبان میں شعروشاعری کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔''

(مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ،جلد اول مرتب : سید رفیع الدین قادری ۲۰۰۸ء،ص:۳۹۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر زورؔ نے بتایا ہے کہ اورنگ زیب نے جب دکن کو فتح کیا تو شمال اور دکن کے لوگوں کے آنے جانے سے میل ملاپ زیادہ بڑھنے لگا۔شمال کے لوگ دکن آنے لگے اور دکن کے لوگ شمال جانے لگے۔ پھر آپسی گفتگو سے دونوں فریقوں نے زبان پر بھی توجہ مرکوز کی۔ چوں کہ دکن والوں نے اپنی زبان میں اچھا خاصا ادبی کام کیا تھا۔ پھر شمال والوں نے یہ پایا کہ ہم لوگ دکن والوں سے اس معاملے میں بہت دور ہیں۔شمال میں کسی نے بھی بول چال کی زبان میں شعرو شاعری کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے دکنی زبان کا اثر براہِ راست لیا لے اور دکنی کے کئی الفاظ استعمال کرنے لگے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایک اور مضمون بعنوان ''دہلی میں اردو شاعری کا آغاز'' میں زبانوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''برج بھاشا کی طرح کوئی دیسی زبان ایسی نہ تھی جو دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ علمی یا ادبی قرار دی جاسکتی۔دکنی میں یا تو دراویڈی زبانیں تھیں یا مرہٹی۔اور یہ زبانیں اس ہندوستانی زبان کو کوئی اصولی یا اہم فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھیں جو مسلمانوں کے ساتھ دکن میں گئیں۔اس کے علاوہ یہ دیسی زبانیں برج بھاشا کی طرح دکن کے ہندوؤں کی اعلیٰ ادبی اور علمی زبانیں بھی نہیں تھیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دکن کے مسلمان یا تو فارسی میں لکھتے یا اپنی اس ہندوستانی میں جوان ہمراہ آئی تھی اور ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی جارہی تھی۔''

(مضامین ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ،جلد اول ،مرتب سید رفیع الدین قادری،۲۰۰۸ء،ص ۵۰۳)

ایسی کوئی زبان نہیں تھی جو دہلی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ علمی یا ادبی کہی جاسکتی تھی۔صرف دیسی زبان برج بھاشا ہی تھی جو دونوں قوموں کا آپسی وسیلہ تھی۔ اس کے برعکس دکن میں دراویڈی یا مرہٹی زبانیں تھیں اور یہ

www.urduacademyts.com

زبانیں اس ہندوستانی زبان کو کوئی اصولی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی تھیں۔اس کے علاوہ یہ دیسی زبانیں برج بھاشا کی طرح دکن کے ہندوؤں کی اعلیٰ زبانیں بھی نہیں تھیں ۔اس کی وجہ یہ رہی کہ دکن کے مسلمان یا تو فارسی میں لکھتے یا اپنی اس ہندوستانی میں لکھتے جوان کے ساتھ آئی تھی۔ساتھ ہی ہندوستانی زبان حکومت کی ترقی سے بھی کامیاب ہوتی جارہی تھی ۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے مضمون ''لسانیات۔مقاصد،فوائداور تاریخ'' میں لسانیاتی علم کے مقصد پر وضاحت بیان کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

''صرف اساتذہ السنہ ہی کو لسانیات سے دلچسپی نہیں بلکہ بعض دیگر علوم وفنون کے ماہرین کو بھی اس کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے ۔نفسیات ، فلسفہ، عمرانیات اور بشریات پر تحقیق وتفتیش کرنے کے سلسلہ میں لسانیات کی مدد کئی طرح سے ناگزیر ثابت ہوتی ہے اور یورپ وامریکہ میں جہاں انسانی ذہنیت اور زندگی کے ہر شعبہ کی جانچ پڑتال کی جارہی ہے' اصول وارتقائے لسانیات سے جگہ جگہ فائدے حاصل کئے جاتے ہیں۔''

(ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر محی الدین قادی زورؔ، ایڈیشن ۲۰۱۱ء، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ص ۱۹)

مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر زورؔ نے لسانیات کے فوائد بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ صرف ماہرین زبان اساتذہ کو لسانیات سے دلچسپی نہیں ہے بلکہ دیگر علوم وفنون کے ماہرین کو بھی لسانیات کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے۔کئی بار لسانیات کا مطالعہ دوسرے شعبوں میں بھی کیا جاتا ہے جیسے کہ نفسیات، عمرانیات کے ساتھ ساتھ بشریات میں بھی کبھی تحقیق کرتے وقت مدد لی جاسکتی ہے۔ چوں کہ یورپ اور امریکہ میں انسانی ذہنیت اور زندگی کے تقریباً ہر شعبے کی جانچ پڑتال ہوتی رہتی ہے۔اس اعتبار سے اگر ہم دیکھیں گے تو اصول اور ارتقائے لسانیات سے ہر ملک یعنی ہر جگہ فائدے حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ آوازوں کی تبدیلی کے حوالے سے مضمون ''فطری ارتقا۔صوتی تغیر وتبدل، ادغامی اثرات'' میں ایک دوسری نسل تک لفظوں کی پرورش پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صوتی تبدیلیوں کی سب سے پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ایک نسل دوسری نسل کے لیے جو لسانی ورثہ چھوڑ جاتی ہے وہ بعینہ ایک اور معین نہیں ہوتا۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نسل کے بعد اس کی آوازیں اور اس کے عضوی عادات واطوار غیر محسوس طور پر کچھ نہ کچھ تبدیلی پاتے ہیں۔ یہ تبدیلی اکثر نتیجہ خیز ہوتی ہے۔''

(ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر محی الدین قادی زورؔ، ایڈیشن ۲۰۱۱ء، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ص:۳۴)

اس اقتباس میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ صوتی تبدیلیوں کی پہلی اور اہم وجہ عضویاتی ہے۔ کیونکہ ایک نسل جب دوسری نسل کے لیے لسانی ورثہ چھوڑتی ہے وہ برابر اسی ہیئت میں نہیں رہتی ہے۔ وہ زمانے کے اعتبار کے ساتھ

www.urduacademyts.com

بدلتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کا ماننا ہے کہ ایک نسل کے بعد اس کی لسانی آوازیں اور عضوی عادات واطوار غیر محسوسیت کے ساتھ کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور پاتے ہیں۔ اگر اس تبدیلی پر غور کیا جائے تو یہ تبدیلی نتیجہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے ان آوازوں کی تبدیلی پر مکمل وضاحت پیش کرتے ہوئے دوسرے ایک مضمون بعنوان ''صوتی تبدیلیوں کی قسمیں'' میں تفصیل سے بحث کی ہے وہ یوں رقم طراز ہیں:

''جہاں سنسکرت میں ''رو'' کی آواز میں ''ت''، ''س'' کی آواز ''چھ'' میں منتقل ہوگئی۔ زبان کے اس فطری ارتقاء کے سلسلہ میں ان سماعی الفاظ کا ذکر بھی ضروری ہے جو زبان کے کسی موجود لفظ کو دیکھ کر اس کے ہم شکل بنا لیے جاتے ہیں اس طریقۂ کار میں بنانے والوں کے ارادہ و اختیار کو دخل نہیں۔ زبان استعمال کرنے والے غیر محسوس طریقہ پر الفاظ بناتے اور استعمال کرنے لگتے ہیں۔ یہ نئے الفاظ زبان کے موجود لفظوں سے شکل وصورت شباہت اور صوتی عناصر میں اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ بنانے والوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں جو پہلے زبان میں موجود نہیں تھا۔''

(ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر محی الدین قادی زورؔ، ایڈیشن ۲۰۱۱ء ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ص:۴۳)

مندجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹر زورؔ بتاتے ہیں کہ سنسکرت میں ''رو'' کی آواز میں ''ت''، ''س'' کی آواز ''چھ'' میں منتقل ہوتی ہے۔ ان سماعی الفاظ کا تذکرہ کرنا بھی اہم ہے کہ جو زبان کے کسی موجودہ لفظ کو دیکھ کر ہم شکل بنا لیتے ہیں۔ اس طریقۂ کار میں بنانے والوں کو کوئی دخل حاصل نہیں کہ وہ اس میں کوئی چھیڑ چھاڑ کر سکتے ہیں۔ زبان کے استعمال کرنے والے غیر محسوس طریقے پر الفاظ بناتے ہیں اور ان لفظوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔ یہ الفاظ نئے موجودہ لفظوں سے شکل وصورت شباہت اور صوتی عناصر میں ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں کہ بنانے والوں کو بھی اس کا احساس پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ایسا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں جو پہلے زبان میں موجود نہیں تھا۔ اس وضاحت سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نئے لفظ ایسے بنتے رہتے ہیں کہ زبان کے بولنے والوں کو بھی تب تک اندازہ نہیں ہوتا جب تک کہ وہ نیا لفظ تحریر میں نہ آئے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے زبانوں کا مطالعہ کرتے وقت دکنی اور گجراتی زبان کے لفظوں میں اختلاف پاتے ہوئے مضمون ''دکنی اور گجراتی کے اختلافات'' میں ان کی مکمل تفصیل پیش کی۔ وہ لکھتے ہیں:

''حرف علت۔ دکنی ہندوستانی میں ایک خاص حرف علت ایسا ہے جو شمال میں نہیں پایا جاتا۔ اس حرف علت کا تلفظ نہ تو معمولی پیش کی طرح ہے اور نہ واؤ معروف کی طرح۔ اس کا مخزن ان دونوں کے درمیان ہے یہ آواز دراویڈی ہے اور اکثر انہیں لفظوں میں پائی جاتی ہے جو اسی خاندان کی زبانوں سے اردو میں داخل ہوگئے ہیں۔ مثلاً

www.urduacademyts.com

پُٹا (چھوکرا)، دُبا (موٹا)، بّرا (توند)، ڈپّا (ٹوپی) وغیرہ۔''

(ہندوستانی لسانیات، ڈاکٹر محی الدین قادی زورؔ، ایڈیشن ۲۰۱۱ء، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ص: ۱۱۵)

حرف علت دکنی میں ایک خاص حرف ہے جو شمالی ہند میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اس حرف علت کا تلفظ نہ تو معمولی پیش کی طرح ہے اور نہ واؤ معروف کی طرح۔ اس حرف علت کا مخزن دونوں کے درمیان ہے۔ یہ آواز دراویڈی ہے۔ تقریباً انہی لفظوں میں پائی جاتی ہے جو دراوڈی زبانوں سے ہی اردو میں داخل ہوگئے ہیں۔ مثلاً 'پوٹا' یعنی چھوکرا، 'دُبا' یعنی موٹا، 'بّرا' یعنی توند، ڈوپّا یعنی ٹوپی وغیرہ۔ ان لفظوں سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ دکنی اور گجراتی زبان میں لفظوں کی فرق کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے کشمیریوں کو اردو سے رشتہ، وابستگی اور شجرۂ نسب کے بارے میں ''کشمیری اور اردو'' میں اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

''صرف وہی زبانیں زندہ رہتی ہیں جن کے دروازے دوسری زبانوں اور ان کے ادب اور خیالات کی آمدورفت کے لیے کھلے رہتے ہیں اور جن کے ادیب و دانشور اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں سے محبت کرتے ہیں۔ کشمیریوں کے لیے اردو غیر زبان نہیں ہے بلکہ لسانیاتی رشتے کے لحاظ سے بہت قریب ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل شجرۂ نسب سے واضح ہوگا:

ہندایرانی

ایرانی	دردستانی	ہندآریائی
/	/	/
فارسی	کشمیری	اردو

(افادات زورؔ، جلد پنجم (لسانیات)، ڈاکٹر زورؔ، مرتب سید رفیع الدین قادری، ۲۰۱۷ء دہلی، ص: ۱۱۵۔۱۱۶)

سماج میں وہی زبانیں زندہ رہتی ہیں جن کے دروازے دوسری زبانوں کے ادیب اور خیالات کی آمد و رفت کے لیے کھلے رہیں گے۔ ساتھ ہی یہ ادیب اپنی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ اب اگر یہاں کشمیریوں کی بات کی جائے تو ان کے لیے اردو کوئی غیر زبان نہیں ہے بلکہ لسانی رشتے کے لحاظ سے بہت قریب ہے۔ بقول ڈاکٹر زورؔ ہندآریائی زبان سے دردستانی نکلی ہے اور دردستانی سے برائے راست کشمیری نکلی ہے۔ آپس میں یہی نسبت ہے کشمیری زبان اور اردو زبان کی۔ دونوں زبانوں کے کئی الفاظ مشترکہ لکھے جاتے ہیں۔ جس طرح اردو میں لکھتے ہیں، اسی طرح ان لفظوں کو کشمیری میں بھی لکھتے ہیں۔

☆☆☆

نظیر احمد گنائی
فرصل کلگام، کشمیر۔ 192232
فون: 7889779687

www.urduacademyts.com

مکرم نیاز کا افسانوی مجموعہ ''راستے خاموش ہیں'' کا ایک معروضی جائزہ

اردو ادب کی تاریخ کی سبزہ زاری صدیوں پہ محیط ہے۔اس عرصے کے دوران بیشمار ہی نابغۂ روزگار ہستیوں نے اردو ادب کے اثاثے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے جو کہ ہمارے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس زبان میں ہر صنف پر لکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد رہی ہے جنھوں نے ادب کی بے پایاں خدمت کے لئے خود کو وقف کر دیا تھا۔ فی الوقت بھی اردو ادب ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہے جنھوں نے اپنی علمی و فکری صلاحیتوں سے لوگوں کے فکر و ذہن کو بدلنے و متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ نہ صرف علمی میدان میں برسر پیکار ہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ تکنیکی صلاحیتوں کے سہارے بھی اردو کو اوج کمال تک پہنچانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ کیوں کہ زمانے کی تبدیلی نے اس پہلو کو لازمی کر دیا ہے کہ اسے بدلتے زمانے کے ذرائع اور وسائل سے آراستہ کیا جائے۔ ایسے دور میں جب کہ لفظ صفحات سے ہوتے ہوئے اسکرین کی دنیا میں داخل ہو گئے ہیں، اردو ادب نے بھی اس تبدیلی کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے اور آج کے اردو قلمکاروں میں بہترے ایسے ہیں جو دونوں ہی سطح پہ اردو ادب کی بلندی کو مستحکم بنانے میں کوشاں ہیں۔ انھیں میں سے ایک شخصیت سید مکرم نیاز صاحب کی بھی ہے جن کے قلم کی روانی اور خیالات کا تسلسل اور جدت پسند زاویوں کی فکر انگیزی کی اپنی ایک پہچان ہے۔انھوں نے ہمیشہ اپنے قلم کے ذریعے افسانوں کی صنف میں تمثیلی کردار کی تشکیل کر کے معاشرتی اقدار اور شکستہ حال روایات اور اپنے نظریات و خیالات کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے اندر ایک کسک ہے جو اُن کے افکار اور لفظوں کو مہمیز دیتی ہے۔شاید وہ کرشن چندر کے اس قول کے تحت ہے کہ ''کرب چاہے کسی قسم کا ہو، زندگی سے نکل جائے تو فن مر جاتا ہے''۔اسی لیے وہ اپنے کرب و کسک کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔مکرم نیاز صاحب نے کبھی بھی خود کو کسی مخصوص خیال کا پابند بنانے سے گریز کیا۔انھوں نے وسعت خیالی اور تجدیدی ذہنیت کو ہمیشہ اپنائے رکھا۔ اور صحت مند اسلوب پر اپنی افسانہ نگاری کے ہنر کو آزمایا اور بوجھل حقیقتوں کو سادگی سے پیش کرنے کے فن کو لمحہ بہ لمحہ نکھارا ہے۔

مکرم نیاز کی تکنیکی دلچسپی اور صلاحیت نے بیشمار نوجوان قلمکاروں کو ابھرنے کا موقع دیا ہے ایک دہائی سے زیادہ عرصے سے وہ تعمیر نیوز ویب سائٹ کے تحت اردو ادب کی نشو و نما میں قابل ذکر کردار ادا کر رہے ہیں۔ پروفیشن کے اعتبار سے اگرچہ وہ ایک انجینئر ہیں لیکن ان کا ادبی ذوق ایسا ہے جس پر سوال اٹھانے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ان کو یہ ادبی ذوق اور اعلی اسلوب ان کے والد کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے۔انھوں نے اس وراثت کی آبرو کو کبھی بھی ضرب نہیں پہنچنے دی۔قلم کے ذریعے اردو ادب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف جہات میں انھوں نے اپنے آپ کو سدا مصروف

مضامین

www.urduacademyts.com

عمل رکھا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ لکھا۔ ابھی حال ہی میں ان کے افسانوں کا مجموعہ ''راستے خاموش ہیں'' اشاعت کے مرحلے سے گزر کر منظر عام پر آیا ہے جس کو ادبی پلیٹ فارم پر تسلی بخش پذیرائی ملی ہے۔ یہ کتاب اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کا سرورق اس کے عنوان کی طرح کافی تجسّس کن اور دیدہ زیب ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی خاموش راستے مجھ سے مخاطب ہیں اور کچھ کہنے کی لئے میں ہیں اور میں لب گویا لئے محویت کے عالم میں خاموشی سے بس انھیں تکے جارہی ہوں اور اسے سننے کی تگ و دو کر رہی ہوں۔ مکرم صاحب نے پیش لفظ کے تحت ''جو کہا نہیں وہ سنا کرو'' کے ذیل میں مونولاگ کی طرح اپنے تاثرات و جذبات کو لکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے جو کہ میری دانست کے مطابق ایک اچھا پیش لفظ ہے۔ انھوں نے اس میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے اس طرح لکھا ہے کہ جیسے وہ اپنے اندر کے ساز کے تاروں کو خود ہی چھیڑ کر خود ہی سن رہے ہوں۔ ایک وجد کی کیفیت ہے جس میں شعور کی پرتیں کھل رہی ہیں۔ جیسے نادیدہ احساس اپنے ہونے کا ثبوت پیش کر رہا ہو' گذرے ہوئے لمحات کی نمایاں یادیں حافظے کے در پہ دستک دے رہی ہوں اور حال و مستقبل کے زائچے پہ لکیریں کھنچ رہی ہوں۔ انھوں نے جس طرح سے اسے خود کلامی کے طور پر لکھا ہے کہیں نہ کہیں یہ قاری کے دروں احساسات کو بھی مہمیز دینے کی کوشش کرتا ہے اور اسی طرح سے اس کے بعد کے لفظوں میں سوالات اور تشریح و توضیح کا ایک تسلسل ہے۔ اس کو پڑھتے پڑھتے جب نظر سے یہ سطر گذری جہاں انھوں نے یہ لکھا تھا:

''کسی افسانے کو جانچنے کے لئے ہمیں تین چیزوں پر نظر رکھنا اشد ضروری ہے۔ پہلی چیز یہ کہ ہم افسانے میں قلمکار کے واردات اور افکار کو تلاش کرنے کی کوشش کریں اور افسانے کو اسی زاویہ نظر پر پرکھیں۔ دوسرے عام قاری کے ذہن، فہم و ادراک کو سامنے رکھ کر افسانہ کو جانچیں۔ تیسرے یہ کہ خود اپنی استعداد کو روبہ کار لا کر اپنے ڈھنگ سے افسانہ کو سمجھنے کی کوشش کریں اس طرح بہت ساری چیزوں میں جو چیز کھل کر سامنے آتی ہے وہ ہے مقصدیت۔ افسانہ نام ہی بامقصد تخلیق کا ہے۔''

بیشک اس خیال سے میں بھی صد فیصد متفق ہوں کہ کسی افسانے کا اصل کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ مقصدیت کی بنیاد پر لکھا گیا ہو دوسرے اس کا اسلوب ایسا ہو جو ہر طرح کے قاری کے لئے قابل فہم اور اس کے لئے زود اثر ہو تیسرے اس میں افسانہ نگار کے تجربات و نظریات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گی اس میں صحتمند روایات کے ساتھ بدلتے وقت کے تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے کیوں کہ ہر قاری کی ذہنی ساخت اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک افسانہ نگار کی حساسیت جتنی حقیقت پسندانہ ہوگی اتنی اس کی تحریریں متاثر کن ہوں گی۔ غیر حقیقی تحاریر میں خواہ کتنا ہی لفظوں کو آراستہ و پیراستہ کر کے پیش کیا جائے قاری کے دل و دماغ پر ایسی تحریریں کبھی زیادہ دیر

www.urduacademyts.com

تک اپنا اثر باقی نہیں رکھتیں۔ دیومالائی اساطیر سے فینٹسی create کر کے آج کے قارئین کو تھوڑی دیر کے لئے بہلایا تو جاسکتا ہے لیکن ان کی سوچوں کو نہیں بدلا جاسکتا۔

جب انسان کی اندرونی نفسیات، جذبات اور کشمکش کی کیفیت اور داخلی محرکات کی ہیئت کو کسی افسانے میں بیان کیا جاتا ہے تو قاری غیر شعوری طور پر ہی اس سے انسیت محسوس کرنے لگتا ہے اور ہر افسانہ نگار کو ایسا فن سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس پیمانے پر اگر مکرم نیاز صاحب کو پرکھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے حقیقت کی بساط پہ ہی اپنے کرداروں کی تخلیق کی ہے۔ مکرم نیاز صاحب کے افسانوں میں اخلاقی روایات کی پاسداری کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ کیوں کہ جب اخلاقیات کو پامال کرنے والے مناظر کو لفظوں کی صورت کشید کیا جانے لگے تو معاشرتی تہذیب کو زوال پزیر ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ ایک قلمکار کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح میں اپنا حق ادا کرے اور روبہ زوال ثقافتوں کو مزید پستی کی طرف مائل نہ ہونے دے۔ میں یہ بات بنا کسی مبالغہ آرائی کے کہہ سکتی ہوں کہ مکرم نیاز صاحب نے جس طرح مونولاگ کی صورت اس پیش لفظ کو لکھا ہے میرے خیال میں اس کو اگر کسی اور طرح لکھتے تو شاید یہ اتنا زوداثر نہیں ہوتا اسی گفت وشنید میں کہا جانے والا یہ جملہ:

"فقرہ شناس نہیں نکتہ شناس بنو فقرہ شناسی تو تمھارے ذخیرۂ الفاظ میں اضافے کا موجب بنے گی۔ نکتہ شناسی تمھیں حیات انسانی کے ان رموز سے بہرہ ور کرے گی جو زندگی کو آسان، خوشگوار اور کامیاب بنائیں گے"

بیشک یہ بات، یہ نظریہ قابل غور ہے۔ زندگی کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لئے لفظوں کی الجھنوں سے آزاد رہنا ضروری ہے۔ کیوں کہ بعض اوقات لفظوں کی شائستگی کا بھرم تو رہ جاتا ہے لیکن زندگی کے صحتمند اقدار بھول بھلیوں میں کہیں گم سے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان کو اپنے ہدف کا علم ہو۔ اور اسے اپنے اندر سے آنے والی آوازوں کو سننا آتا ہو۔ حقیقت شناسی ہی دراصل نکتہ شناسی ہے۔ مکرم صاحب نے اپنی اس خودکلامی کو بہت اچھی طرح سے نبھایا ہے۔

اس کے ساتھ دیگر کئی معاصرین ادب کی آراء اور تبصروں کو انھوں نے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے اور کتاب کے آخر میں اپنے قارئین اور ہمعصر افسانہ نگاروں کے تنقیدی اور توصیفی تبصروں کو جوگا ہے بگا ہے ان کے افسانوں پر سوشل میڈیا پر کئے گئے تھے شامل کیا ہے۔ مکرم نیاز صاحب نے ادبی معاصرین اور قارئین کی تنقیدی آراء کو ایک صلے کی طرح قبول کیا ہے جو ان کے لئے غور وفکر کے راستے ہموار کرتی ہے اور معاشرتی تبدیلیوں اور مضبوط کلاسیکی رویوں کو اپنائے رکھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ انہیں تبصروں میں سے ایک تبصرہ علامہ اعجاز فرخ صاحب کا ہے۔ انھوں نے مکرم نیاز صاحب کو خاموش راستوں کا مسافر کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ یہ انداز تخاطب کہیں نہ کہیں مکرم صاحب کی شخصیت کی عمدہ تصویر کشی کر رہا ہے۔

www.urduacademyts.com

علامہ اعجاز صاحب کے علاوہ اور کئی ادیب ہیں جنہوں نے اپنے زریں خیالات میں مکرم صاحب کی افسانہ نگاری کے ہر زاویے پر روشنی ڈالی ہے۔ یوں تو وہ سب ہی اپنی جگہ بہترین ہیں لیکن میں صرف محمد حمید شاہد کی خیال ارائی پر کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے مکرم نیاز صاحب کی اس سوچ کو منکشف کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے افسانہ نگاری کو مہمیز دینے میں کارفرما رہی ہے۔ انھوں نے ان کے موضوعات کے انتخاب کو بھی سراہا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے:

" مکرم نیاز کو فطرت سے گریز کرنا پسند ہے نہ ہی فطرت کا قیدی ہو کر سماجی تخلیق میں ناروا رخنے ڈالنا۔ سو اپنی فکر کے اس چراغ کی روشنی کو اپنے قاری تک پہنچانے کے لئے وہ ایسی کہانی لکھتے ہیں جس میں فطری بہاؤ قائم رہتا ہے"۔

بیشک ایسا ہی ہے جب مکرم نیاز کے افسانوں پر نگاہ پڑتی ہے، پھر سطر بعد سطر پڑھنے پر کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ مجھے اس افسانوی مجموعے میں جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ تھا ان کا معتدل مزاج اور انھوں نے جس طرح سے اپنے قارئین کی تنقید بھری رایوں کو نہ صرف پڑھا بلکہ اسے اپنے تمام قارئین کے لئے جس طرح کتاب میں جگہ دی ہے یہ انھیں کا ظرف ہے ورنہ غالباً لوگ تنقید کو حذف کرنے میں لمحہ نہیں لگاتے اور تعریفوں کے پل کو بڑی شائستگی اور فخر کے ساتھ کتابی اوراق پہ یوں سجاتے ہیں جیسے کہ بس یہی ایک رائے ہے جو وجود رکھتی ہے، باقی اس کے سوا کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں۔ بیشک ہر ماہر شہسوار میدان میں گر گر کر ہی شہسواری کا ہنر سیکھتا ہے اور پھر ہر بار ایک نئی ہمت و حوصلے کے ساتھ کھڑے ہو جانے پر ہی اس کے فن کو شناخت ملتی ہے۔ مکرم نیاز صاحب نے بھی اسی عزم و حوصلے کو روا رکھا ہے۔ انھوں نے کبھی گر کر اٹھنے میں عار محسوس نہیں کیا۔

مذکورہ کتاب میں ان کے کل تیرہ (۱۳) افسانے شامل ہیں جو کہ ہندوستان اور پاکستان کے موقر جرائد و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کو "راستے خاموش ہیں" کا عنوان دیا گیا ہے، جو کہیں نہ کہیں قاری کی سوچوں میں سوال پیدا کرتا ہے کہ اس راستے کا مسافر کون ہے اور یہ مسافر کس طرح اس کی مسافت کو طئے کرتا ہے؟ یہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ اس میں شامل کئے گئے ان کے ایک افسانے کا عنوان بھی ہے۔ ہمارے یہاں لفظوں کی بازگشت کا ذکر تو جا بجا ہوتا ہے لیکن خاموشی انھیں ایک ایسی زبان معلوم ہوتی ہے جسے وہ غیر ضروری سمجھ کر اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔ حالاں کہ دانشوروں کا قول ہے کہ خاموشی اسرار کائنات اور خودی، معرفت اور راز ہستی سے پردے ہٹا دیتی ہے، انسان کو خود سے متعارف کروا دیتی ہے اور مقصد حیات کی تشکیل میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاموشی انسان کی ہو یا کسی اور شئے کی وہ پراسرار ہوتی ہے، ہر سماعت پر اس کا انکشاف نہیں ہوتا۔ مکرم نیاز صاحب نے اِنہیں خاموشیوں کو محسوس کر کے اُنھیں لفظوں کے ذریعے ہم تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس افسانے "راستے خاموش ہیں" میں مکرم صاحب نے دیار غیر میں جا بسنے والوں کے ان نظریات کی

www.urduacademyts.com

نشاندہی کی ہے جس کی وجہ سے انھیں اپنے وطن سے بے رغبتی محسوس ہونے لگتی ہے، وہ وقت کی تبدیلیوں اور تعیش زندگی کے حصول میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ اپنی اصل پہچان کو ہی مجروح کرنے پر تل جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک سچ ہے کہ ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا کہ ہر دیار غیر کو جانے والا اپنے وطن سے دوری کا انتخاب خود غرضی میں کرے، کچھ مجبوریوں کی بیڑیاں ہوتی ہیں اور اپنوں کو آسانی اور خوشی دینے کا ایک خواب ہوتا ہے جسے وہ آنکھوں میں سجائے ہجرت کا کرب سہتے ہیں۔

اس افسانے کو پڑھتے ہوئے مکرم صاحب نے اگرچہ بہت سے پہلوؤں کو تشنہ چھوڑ دیا ہے لیکن شاید ان کا ابہام قاری سے شعور کا متقاضی ہے۔ جب راستے خاموش ہوں تو پھر حواس خمسہ کو یکسو ہو کر اس کی ان کہی کو سمجھنے کی تگ ودو کرنی پڑتی ہے اور جب ہم ہمہ تن متوجہ ہوتے ہیں فضاؤں میں بکھرے ہوئے ساز میں ایک ردھم پیدا ہو جاتا ہے جو ہمارے ذہنی اعصاب پر فکر وفن کے در وا کر دیتی ہے۔

انھیں افسانوں کی فہرست میں ایک افسانہ ''آگہی'' بھی شامل ہے۔ میں پہلے اس عنوان کے انتخاب کو سراہنا چاہتی ہوں کہ یہ لفظ اگر اپنی ساری زندہ حقیقت کے ساتھ کسی انسان کے ذہن میں اتر جائے تو واقعی پھر اس کی زندگی اور سوچ کا سارا معیار بدل جاتا ہے۔ آگہی علم کی معراج ہے۔ اور ہر سیکھنے کا حاصل ہے۔ سیر باطن کا صلہ ہے اور انسانوں کو ملنے والا ایک اعلیٰ شرف ہے۔ یہ تو رہی موضوع کی بات۔ اب نظر اس کے تحت لکھے گئے افسانے پر ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہو رہا کہ یہ بے شعوری کی دھند ہمارے چاروں طرف اس طرح موجود ہے کہ ہم نے اب اس دھندزدہ شئے کو ہی حقیقی ہیئت سمجھ لیا ہے۔ ہمیں یہ جستجو ہی نہیں رہی کہ ہم سچائی کو تلاشیں اور اصل چہروں کو دیکھیں۔ ہم اپنی ذات کے خول میں بند وہ قیدی ہیں جسے رہائی سے کوئی غرض نہیں اور جب انھیں لوگوں میں کوئی ایسا کردار جنم لیتا ہے جس نے حقیقت کا چہرہ دیکھا ہوتا ہے تو لوگ اسے اپنی بے حسی کا دفاع کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو۔ جب کہ حقیقت بہت سادہ ہے اور جو ہم دیکھنا نہیں چاہتے ایسے میں اس کے شعور کا کرب اس کی اذیت کو بڑھا بھی دیتا ہے اور کبھی کم بھی کر دیتا ہے۔ جب آگہی اپنے در وا کرتی ہے تو پھر عمروں کا حساب بے معنی ہو جاتا ہے، پھر سفاک حقیقت ہی باقی رہ جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ان کے تمام ہی افسانے عہد حاضر کی تہذیب وثقافت کے دائرے میں لکھے گئے ہیں۔ انھوں نے زبان و بیان میں حتی المقدور سادگی کو برتا ہے اور اسلوب اور تکنیک کا بھی حسب ضرورت خیال رکھا ہے، یہ مکرم نیاز صاحب کی ایک عمدہ کاوش ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین کے ذہنوں پر یہ اچھے اثرات مرتب کرے گی اور یہ ادبی اثاثوں میں ایک قابل ذکر اضافہ کا موجب ہوگی۔

☆☆☆

علیزے نجف
پرانا تھانہ، سرائے میر
اعظم گڈھ، اتر پردیش۔

www.urduacademyts.com

تفریحی سرگرمیوں کی اہمیت

دور حاضر میں انسان جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ فراہم کردہ بہت ساری آسائشوں سے لطف اندوز ہورہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسان کو روزمرہ کی زندگی میں بہت سی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور معاشرتی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑرہا ہے۔ بلاشبہ جدیدترین تکنیکی ترقیوں نے گھروں کے ساتھ ساتھ دفتری مقامات، زراعت یا صنعتوں اور زندگی کے ہر شعبے میں ہر طرح کی راحتیں مہیا کی ہیں۔ ٹیکنالوجی نے افراد کا ایک دوسرے پر انحصار بھی کم کیا ہے جس کی وجہ سے معاشرتی اور جسمانی مسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ ٹیکنالوجی نے جسمانی کام کو کم کردیا اور کام کی جگہوں پر شفٹ سسٹم کو متعارف کرایا ہے۔ دن رات کی شفٹ میں کام کرنے والے افراد نے اہل خانہ کو اجنبی بنادیا جس سے جذباتی شور بپا ہے۔ اجتماعی طور پر یہ سارے عوامل طویل عرصے سے خاندانی زندگی، معاشرے اور قوم کو بری طرح متاثر کررہے ہیں۔ ٹی وی، کیبل ٹی وی، ویڈیو سی ڈی گیمز، کمپیوٹر گیمز کی آسانی سے دستیابی نے بچے کی جسمانی سرگرمیوں میں دلچسپی کو کم کردی ہے۔ اس کے نتیجے میں، بہت ساری جسمانی، ذہنی اور جذباتی پریشانیوں نے جنم لیا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے یعنی فرصت کے وقت کو تعمیری انداز میں استعمال کرنا اور طلباء کو جسمانی طور پر متحرک کرنا اس طرح ان کی نشوونما اور ترقی کے لیے غیر فعال تفریحی سرگرمیوں کو فعال بنانا ضروری ہے۔

ایک مشہور قول ہے ''بنا کھیل کے صرف کام جیک کو سست لڑکا بناتا ہے۔''

آج کی اس تیز رفتار اور مسابقتی دنیا میں اس قول کی اہمیت کئی گناہ بڑھ گئی ہے۔ طلباء کو سرپرستوں اور معاشرے نے تعلیمی میدان میں لگی مسابقتی ڈور میں اول آنے کے لیے مطالعہ کے اوقات کو بڑھانے پر مجبور کردیا ہے جس سے فرصت کے لمحات درکار ہونا مشکل ہوگئے ہیں۔ طلبہ زیادہ تر وقت دوستوں میں اور گھر کے باہر گزارتے ہیں۔ لہذا موجودہ حالات میں تفریحی سرگرمیوں (Recreational Activities) کو طلبہ کی زندگی میں شامل کرنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ بلکہ طلبہ کی ذاتی و معاشرتی اقدار کو فروغ دینے میں بھی مدد ملتی ہے۔

تفریح مختلف افراد کے لئے مختلف معنی رکھتی ہے اور اس کا اطلاق بہت سی مختلف سرگرمیوں پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس اصطلاح کا مطلب صرف نوجوانوں اور بڑوں کی سرگرمیاں ہیں تاکہ انہیں چھوٹے بچوں کے کھیلوں کی سرگرمیوں سے ممتاز کیا جاسکے۔ تفریحی سرگرمیاں اکثر تفریح یا خوشی کے لیے کی جاتی ہیں اور اسے ''تفریح'' سمجھا جاتا ہے۔ تفریحی سرگرمیاں اہم نقطہ نظر فراہم کرتی ہیں، توانائی کو بڑھاتی ہیں اور فرد کو اگلا کام کرنے کے لیے تیار کرتی ہیں۔ تفریح فرد کے حواس کو بھی جوان کرتی ہے۔ اور فرد کو تازہ اور خوشگوار

www.urduacademyts.com

زندگی کا احساس دلاتی ہے۔

جیسا کہ ماہرین کہتے ہیں کہ لفظ تفریح Recreation اتنا وسیع ہے کہ اس کے ہر اظہار میں موسیقی، ڈرامہ، کسی بھی آزادانہ سرگرمی، خاص طور پر تخلیقی سرگرمیاں وغیرہ شامل ہیں۔ ''فرصت کے وقت کا کوئی بھی تجربہ یا سرگرمی جس میں ایک فرد لطف اور اطمینان کے لیے اپنی پسند سے مشغول ہو جاتا ہے جو اس کے لیے لطف اور اطمینان براہ راست فراہم کرتی ہے۔''

تفریحی سرگرمیوں کی اقسام:

- کھیل Games and sports
- سماجی سرگرمیاں
- موسیقی کی سرگرمیاں
- فنون اور دستکاری کی سرگرمیاں
- ڈرامائی سرگرمیاں
- رقص کی سرگرمیاں
- فطری اور بیرونی سرگرمیاں
- تعلیمی اور زبان کی سرگرمیاں
- جمع کرنے کی سرگرمیاں
- سوشل سروس کی سرگرمیاں

جسمانی سرگرمیاں جیسے کھیلنا، ورزش کرنا، بیڈمنٹن، ایتھلیٹک، ہاپسکچ، گالف، رنگ ٹینس، جمناسٹکس مارچ، پیراٹڈ بلڈنگ، رسی جمپنگ، ٹمبلنگ، گروپ یا ٹیم کے کھیل (باسکٹ بال، والی بال، ڈاج بال، کِک بال، ٹگ آف وار، نیٹ بال، ٹچ فٹ بال، واٹر پولو وغیرہ)، تیر اندازی، کشتی باڑ، باڑ لگانے، ڈائیونگ، جمپنگ، پتنگ بازی، موٹر سائیکلنگ، پستول یا رائفل شوٹنگ، تیراکی وغیرہ۔

سماجی سرگرمیاں جیسے جماعتیں، ضیافتیں، پکنک، کلب میٹنگز، تفریحی، سالگرہ کی تقریبات، نئے سال کی تقریبات، پنسل اور کاغذی کھیل، ٹیبل ٹینس، کیرمز، شطرنج، وغیرہ وغیرہ۔

کیمپنگ اور بیرونی سرگرمیاں جیسے ڈے کیمپ، رہائشی کیمپ، بیک پیکنگ، فلوٹ ٹرپ وغیرہ۔

آرٹس اور دستکاری کی سرگرمیاں جیسے پینٹنگ، سکریپ بکنگ، سیرامکس، لکڑی سازی وغیرہ۔

ڈرامائی سرگرمیاں جیسے ڈرامے، کٹھ پتلی، اسکیٹس وغیرہ۔

موسیقی کی سرگرمیاں جیسے گانا، بینڈ آواز اور ساز و سامان۔ اس میں میوزک فیسٹیول، ٹیلی ویژن کنسرٹ، میوزک مقابلے، بینڈ کنسرٹ، میوزک کمپوز کرنے، میوزک سننے والے گروپس وغیرہ بھی شامل ہیں۔

ثقافتی سرگرمیاں جیسیفن کی تعریف، موسیقی کی تعریف، پینل، مباحثے کے گروپ وغیرہ۔

خدمت کی سرگرمیاں جیسے دوسروں کے لئے کام کرنے میں تفریح۔

آج طلبہ معاشرتی پیچیدگیوں اور رہن سہن کے سبب جسمانی اور جذباتی طور پر پچھلی نسلوں سے کمزور ہیں۔

www.urduacademyts.com

لہذا یہاں تفریحی سرگرمیوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے اس لئے مجموعی طور پر طلبہ کی زندگی میں تفریح کے اثرات اور ضرورت کو جاننا ضروری ہے۔

تفریح ایک بنیادی انسانی ضرورت: تاریخ کے تمام مراحل میں انسان نے تفریح کے مختلف اقسام تیار کرتے ہوئے اظہار خیال اور ذاتی ترقی کے لئے آؤٹ لیٹس ڈھونڈ لیے ہیں جن میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ درحقیقت تفریح تمام لوگوں کا مشترکہ ورثہ ہے حالانکہ اس کا اظہار مختلف آؤٹ لیٹس یا شکلوں پر مشتمل ہے۔ مثال کے طور پر کھیل، جاگنے کے اوقات وغیرہ۔ کھیل کے ذریعے بچہ نشوونما اور تجربہ حاصل کرتا ہے۔ یہ سرگرمیاں بچہ کی حیاتیاتی خواہش اور زندگی میں ضروری مہارتوں کے حصول کے ذرائع کو پورا کرنے کے لئے آؤٹ لیٹس فراہم کرنے کا فطری طریقہ ہے۔ جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے بالغ زندگی میں، معاش کمانے، کنبہ کی دیکھ بھال کرنے اور انسانی معاشرے میں مقام برقرار رکھنے کے فرائض اور ذمہ داریاں زندگی میں تفریح کی مقدار کو کم کرنے کا رجحان بناتی ہیں۔ پھر بھی تفریح کی خواہش اتنی بنیادی اور آفاقی ہے کہ اسے آسانی سے دبایا نہیں جاسکتا۔

تفریح اور انسانی خوشی: خوشی کو ہمارے آباؤ اجداد نے ہر فرد کے لئے بنیادی حق کے طور پر مانا۔ خوشی کے بغیر تفریح کے ساتھ ساتھ زندگی بھی ادھوری سی لگتی۔ تفریحی ماہر Austin Fox Riggs آسٹن فاکس رگس کا کہنا ہے کہ:

" The function of play is to balance life in relation to work, to afford a refreshing contrast to responsibility and routine, to keep alive the spirit of adventure and that sense of proportion which prevents taking oneself and one's job too seriously and thus to prevent the death of youth and not infrequently the premature death of the man himself."

تفریح اور صحت: جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں "Health is wealth"۔ تفریحی سرگرمیاں خاص طور سے بیرونی سرگرمیاں جسم کی چربی کو گھٹاتی ہیں۔ خون اور کولیسٹرل کی سطح کو کم کرتی ہیں۔ اس سے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہ سرگرمیاں شرکا کو آرام اور بہتر عمل انہضام کا اعزاز دے کر جذباتی استحکام میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مزید تفریحی سرگرمیاں تخلیقی سرگرمی کی حوصلہ افزائی کر کے بچے کو زیادہ جذباتی طور پر مستحکم کرتی ہیں۔ تفریحی سرگرمی مجموعی طور پر ایک بچے کی شخصی صلاحیت اور توانائی کی سطح کو بڑھاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں طلباء اپنی علمی سرگرمیوں پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔ جس سے حاضری کی شرح میں، دلچسپی اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

www.urduacademyts.com

تفریح اور دماغی صحت: مجموعی جسمانی صحت کے لے ذہنی صحت ضروری ہے۔ تفریحی سرگرمیاں تناؤ کو دور کرتی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو پروان چڑھانے کا موقع فراہم کرتی ہیں' توازن اور خود اعتمادی کا احساس مہیا کرتی ہیں جو اضطراب اور افسردگی کو براہ راست کم کرسکتا ہے۔ سیکھنے/ اکتساب کے لیے اس میں ایک حوصلہ افزائی بھی ہے کیونکہ یہ کلاس رومز کی تعلیم میں سیکھے جانے والے مشمولات کی اطلاق کے لیبارٹری کے طور پر کام کرتی ہے۔ یہ تناؤ اور اضطراب کو دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس طرح کی سرگرمیاں طلبا کو زیادہ خود انحصاری، مضبوط اور خود نظم وضبط کے اضافے میں مدد دیتی ہیں۔

تفریح اور بہتر معیار زندگی: ایک امریکی مطالعہ 2000 کے مطابق تفریحی مقام وسرگرمیوں کو ترجیح دینے والے افراد مجموعی طور پر اپنی زندگی سے مطمئن رہتے ہیں۔ تفریحی سرگرمیاں جسمانی اور ذہنی تندرستی کے ساتھ تعلیمی دباؤ کے مابین توازن پیدا کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ تفریح کے اثرات کثیر العمل ہیں۔ یہ خود اظہار خیال، خود تکمیل کی قابلیت، باہمی صلاحیتوں، جسمانی طاقت، تخلیقی اظہار اور جمالیاتی احساس کو استعمال کرنے کے طریقوں کو تقویت بخشتی ہے۔ اس طرح کے اوصاف طلباء پر سازگار اثر ڈالتے ہیں جن کی روزمرہ کی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا تفریح کو تھراپی کے ایک آلے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ (لی 2000) جسمانی سرگرمی پر مبنی تفریح شرکاء کو ورزش کی کمی کی وجہ سے بگڑتی ہوئی جسمانی طاقت سے بحالی میں مدد دیتی ہے اور خود شناسی کے حصول کی صلاحیت تیار کرتی ہے۔ اس سے لوگوں کو روزانہ کی مشکلات سے زیادہ مؤثر طریقے سے نمٹنے میں بھی مدد ملتی ہے کیونکہ یہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پرامید اور زندگی کے بارے میں ایک مثبت نقطہ نظر رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

موجودہ نسل فطری ماحول میں اپنا کم وقت صرف کرتی ہے جس کی وجہ سے جسمانی اور نفسیاتی طور پر حواس کمزور ہوتے ہیں۔ سرپرستوں، تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ حکومت کو ذہن اور جسم کی مجموعی ترقی کے لئے طالب علم کی زندگی میں تفریح شامل کرنے کے لئے ہر ممکن مواقع تلاش کرنا چاہیے۔ یہ تعلیمی نصاب کا حصہ ہونا چاہئے جہاں ایک طالب علم اپنا زیادہ تر وقت صرف کرتا ہے۔ درحقیقت، تعلیمی ترتیب میں تفریحی سرگرمیاں تعلیمی لحاظ سے طالب علم کے لئے کئی طریقوں سے مزید تقویت بخش ہوگی۔

تفریحی کھیل نہ صرف سادہ تفریح یا تفریح کیلئے ہیں بلکہ یہ کسی بھی انسان کو بہت سارے اہم سبق سکھاتی ہے۔

روایتی طرز کے مقابلے میں بیرونی اکتسابی سرگرمیوں میں سیکھنے کے لئے طلبا زیادہ پرجوش ہوتے ہیں جس سے ایک مثبت رویہ فروغ پاتا ہے۔

تفریحی سرگرمیوں سے مواصلات کی مہارت اور ٹیم کی تعمیر میں مدد ملتی ہے کیونکہ مسائل کو حل کرنے کے لئے طلبا کو گروپوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ اس سے آئیڈیاز اور

www.urduacademyts.com

فیڈ بیکس پر مزید مباحثہ ہوگا اور طلبا کو آپس میں تنازعہ حل کرنے میں مدد ملے گی۔تفریحی سرگرمی سے میموری کو بڑھاوا دینے میں بھی مدد ملتی ہے کیونکہ زیادہ عملی تجربہ ہوتا ہے۔تازہ اور دل چسپ ماحول میں دماغ پوری طرح سے معلومات کو جذب کرسکتا ہے۔

تفریحی کھیل بچوں کو خود کو کنٹرول کرنے کا معیار بھی سکھاتے ہیں۔جیتنا اور ہارنا کسی بھی کھیل کے دو رُخ ہوتے ہیں۔تفریحی کھیل بچے کو جذبات پر قابو رکھ کرنا کامی کے ساتھ ساتھ دوسرے کی کامیابی کو قبول کرنے کا درس دیتی ہے۔ کھیل میں شکست کھانے کے بعد بچے اپنی مایوسی کو اعتماد کے ساتھ سنبھال سکتے ہیں۔جب وہ اگلے کھیل کھیلتے ہیں تو وہ نئے جوش و جذبے کے ساتھ واپس آجاتے ہیں۔یہ سبق آئندہ زندگی میں کسی بھی طرح کی صورتحال میں لڑنے میں مدد کرتا ہے۔

تفریحی سرگرمیوں سے اخلاقی نشوونما میں بھی مدد ملتی ہے کیونکہ طلباء کو قیادت، سوال کرنے کے عمل اور قواعد و ضوابط کو انجام دینے اور اپنے طرز عمل کی ذمہ داری قبول کرنے کا موقع ملتا ہے۔تفریحی کھیلوں کو عام طور پر قواعد اور پابندیوں کے ذریعہ ترتیب دیا جاتا ہے۔بچوں کو کھیل کو صحیح طریقے سے کھیلنے کے لئے ان اصولوں پر عمل کرنا ہوگا۔اس کا مطلب ہے کہ نظم وضبط پر عمل پیرا ہونا کامیاب ہونے کا ایک بنیادی عامل ہے۔

تفریحی سرگرمی ہم جماعتی تعلقات اور باہمی مہارت کو بہتر بناتی ہے۔کھیل کھیل کر بچے ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرنا سیکھتے ہیں اور اس طرح معاشرتی بننا سیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ خاموش اور شرمیلے بچے بھی ایک ساتھ کھیلتے ہوئے خود کو زیادہ ہوشیار اور دوستانہ مزاج کے حامل بنا سکتے ہیں۔طلبا تعلیم کے علاوہ دیگر علاقوں میں بھی مہارت حاصل کرسکتے ہیں، جہاں ان کی دلچسپی ہے۔تفریحی سرگرمیاں تعلیمی مہارت کے علاوہ پوشیدہ صلاحیتوں کو بھی دریافت کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں جو بعد میں کیریئر اور مجموعی طور پر زندگی میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔

تفریح کریکٹر ڈیولپمنٹ، جرائم کی روک تھام، برادری، یکجہتی، حوصلہ افزائی اور جمہوریت میں ممد ومعاون ہوتی ہے۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تفریحی سرگرمیاں طالب علم کی جسمانی، ذہنی اور جذباتی طور پر مجموعی طور پر نشوونما میں معاون ہیں۔ یہ نہ صرف علم کے حصول میں مدد کرتی ہے بلکہ اسے ایک صحت مند اور بہتر زندگی گزارنے کے لئے اخلاقی طور پر استعمال کرنے میں مدد کرتی ہے۔یہ طالب علم کو استدلال کے ساتھ سوچنے اور عملی نقطہ نظر کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دیتی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ تعلیم وتربیت،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد۔

www.urduacademyts.com

جنوبی ہند میں بچوں کی نظمیں۔تاریخی جائزہ

اُردو زبان کی پیدائش کا شرف جس طرح شمالی ہندوستان کو حاصل ہے، اسی طرح جنوبی ہندوستان کو اردو ادب کی ابتداء کا شرف حاصل ہے۔ محققین کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ اُردو زبان کی پیدائش شمالی ہند میں ہوئی اور اس کا بچپن دکن کی آزاد فضا میں گزرا، اور اس نے دکن کے علاقوں پر بہت جلد عوامی اور ادبی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ حافظ محمود شیرانی کو چھوڑ کر بیش تر محققین نے حضرت یمین الدین امیر خسرو (۱۲۵۳۔۱۳۲۵ء) کو بچوں کا پہلا شاعر اور ان کی منظوم کتاب ''خالق باری'' کو جو بچوں کو ذخیرۂ الفاظ سکھانے کے لئے ترتیب دی گئی تھی، بچوں کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سیدہ مشہدی نے امیر خسرو کے بعد محمد قلی قطب شاہ معانی (۱۵۶۵۔۱۶۱۱ء) کو بچوں کا دوسرا شاعر قرار دیا ہے۔ بچوں کی نظموں میں موسموں، تہواروں اور کھیل کود وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے، اس اعتبار سے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا وہ حصہ جس میں اس نے ہندو مسلم تہوار، موسم اور کھیل کود وغیرہ سے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے، جیسے: عید بقرعید، نوروز، بسنت، شبِ برات، سال گرہ، بارش، ٹھنڈ کالا، برسات اور سرما، چوگان، پھوکڑی پھوا اور کھمڈی وغیرہ کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے، جیسے بقرعید کے عنوان سے اس کی نظم ہے:

خوشی خباں سنیا عید بکرید
کہ قرباں ہونے آیا عید بکرید
کھلتا مرغ دل کے بوستاں میں
طرب مطرب کو لیایا عید بکرید

اسی طرح قطب شاہی دور کی مثنویوں میں شاہ راجو کی مثنوی ''تحفۃ النصائح'' اور سید بلاقی کی ''معراج نامہ'' اور عادل شاہی دور کی مثنویوں میں محمد امین ایاغی کی مثنوی ''نجات نامہ''، شغلی کی مثنوی ''پند نامہ'' اور مختار کی مثنوی ''معراج نامہ'' اور ''مولود نامہ'' کو بچوں کے اولین ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سیدہ مشہدی نے دکنی دور (مغلیہ دور) کے ادبِ اطفال میں شاہ حسین ذوقی اور ان کی مثنوی ''ماں باپ نامہ'' کا ذکر کیا ہے کہ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں انہوں نے بچوں کو والدین کی عزت، مقام و مرتبہ اور ان عظمت و اہمیت بیان کی ہے، بقول ڈاکٹر سیدہ مشہدی:

''اس مثنوی میں ایسے مسئلے کو چھیڑا گیا ہے جس کا تعلق اخلاق اور مذہب سے ہے، اس سے بچوں کی کردار سازی میں مدد مل سکتی ہے، اور ان کے اندر والدین کے لئے عزت و احترام کا جذبہ ابھارا جاسکتا ہے۔'' (اردو میں بچوں کا ادب: ۱۰۲۔۱۰۳، ایمن پبلی کیشنز رانچی)

اسی طرح آصف جاہی دور میں شیر محمد خاں ایمان کی مثنوی ''برق تاب'' اور نوازش علی خان بہادر شیدا کی مثنوی ''اعجاز احمد'' کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے، نیز ریاست مدراس کے کثیر التصانیف بزرگ مولوی محمد باقر آگاہ (۱۱۵۸۔۱۲۲۰ھ) نے کئی ضخیم مثنویاں لکھیں، جیسے: ہشت بہشت، محبوب القلوب، ریاض الجنان، تحفۂ احباب اور تحفۃ النساء وغیرہ۔

آزادی کے بعد جنوبی ہند میں بچوں کے نظم گو شاعروں میں خورشید احمد جامی، سعادت نذیر اور وقار خلیل کا نام بچوں کے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا، خورشید احمد جامی جس طرح جدیدیت کے ممتاز اور منفرد شاعر شمار کئے جاتے تھے، اسی طرح اپنے دور میں بچوں کے لئے لکھنے والوں میں ممتاز تھے، ان کی نظموں کے مجموعے: شمعِ حیات (۱۹۴۷ء) نشانِ راہ (۱۹۴۸ء) اور تاروں کی دنیا (۱۹۵۲ء) شائع ہو چکے ہیں۔

سعادت نذیر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد میں مشہور تھے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''پھول مالا'' کے نام سے موجود ہے۔ اس مجموعہ میں انہوں نے قومی، وطنی اخلاقی اور عصری ایجادات پر بڑی پر اثر نظمیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ دردمندی اور پیار کے ساتھ بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کے مشہور شاعر اور ادبی صحافی وقار خلیل نے بچوں کے لئے آسان اور دل کش زبان میں شاعری کی ہے، ان کی نظمیں آندھرا پردیش کے سرکاری نصاب میں شامل رہی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں بچوں کے لئے ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ ''ڈالی ڈالی پھول'' شائع ہوا تھا، ان نظموں میں وطن سے محبت، بڑوں کا

www.urduacademyts.com

احترام، چھوٹوں پر شفقت، انسانیت کی حرمت اور مذاہبِ عالم کی تقدیس وغیرہ پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ کتاب، مکتب کی طرف دوڑ، نیا گیت، علم و عمل، میری امی گلاب، نمائش اور پتنگوں کے دن ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ ان کی (۳۵) نظموں کا مجموعہ ''حرف حرف نظم'' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے شائع ہوا ہے، ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے، تراکیب اور اضافتوں سے خالی ہے، ان کی بیش تر نظموں میں اخلاقی اقدار، محبت اور خدمت کا پیغام ملتا ہے۔

دورِ حاضر میں جنوبی ہند میں بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اس دور میں بعض شاعر کی شناخت بچوں کے شاعر و ادیب کی حیثیت سے ہو چکی ہے، جیسے: حافظ کرناٹکی، ان کے علاوہ تلنگانہ، آندھرا پردیش، کرناٹک اور تمل ناڈو میں کئی شاعر اپنی نظموں کے ذریعہ بچوں کے اخلاق و کردار اور سیرت سازی کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ادبِ اسلامی کے بزرگ شاعر مسعود جاوید ہاشمی نے بچوں کے شاعر، ادیب، مضمون نگار اور صحافی کی حیثیت سے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں، ابوالفہم وحید علی خان کے ساتھ مل کر آپ بچوں کا اہم رسالہ ''ہمارے نونہال'' نکالا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ۲۰۱۰ء سے بچوں کا دولسانی اردو و انگریزی میں ماہ نامہ ''فنکارِ نو'' کے نام سے نکالا گیا تھا، جو حال ہی میں بند ہو گیا۔ ان کی نظمیں فنکارِ نو کے علاوہ ضمیمہ گلدستہ روز نامہ منصف حیدرآباد میں شائع ہوئی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے حمد، نعت، دعا، عیدین اور موسم وغیرہ سے متعلق دل چسپ نظمیں لکھی ہیں۔

بزرگ استاد شاعر عبدالرحمٰن جامی نے بچوں کے لئے بھی خاصی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں۔ انہوں نے بچوں کی دل چسپی، رجحان اور ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بچوں کے کھیل کود اور تعلیمی امور پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ مزاحیہ، آدابِ زندگی، اخلاقیات اور مذہبی معلومات پر بھی کئی نظمیں کہی ہیں، جو ضمیمہ روز نامہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہوتی ہیں۔ جامی صاحب نے جدید طریقۂ تدریس اور جدید سائنسی ایجادات پر نظمیں لکھ کر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے، اس سلسلہ میں ان کی مندرجہ ذیل نظمیں قابلِ ذکر ہیں: ٹی وی، ہوائی جہاز، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، عصری ٹکنالوجی اور سل فون وغیرہ۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''جہانِ اطفال'' ڈاکٹر عبدالقدوس نے مرتّب کیا ہے، جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

پروفیسر ایس۔ اے مجید بیدار ایک زمانہ سے بچوں کے لئے نظمیں اور کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ آپ بچوں کی ذہنی و علمی سطح کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں کی زبان بڑی آسان، ہلکی پھلکی، شیریں اور موسیقی آمیز ہوتی ہے۔ قومی نظموں میں ان کی زبان ہندی کی آمیزش سے بہت سبک اور ترنم ریز ہو گئی ہے۔ ان کی نظمیں زیادہ تر بچوں کا ماہ نامہ امنگ دہلی اور دوماہی ''عتبارہ'' بنگلور میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ''پیاری اماں'' ''بچے بھارت کی شان'' اور ''بھارت کو ہم سورگ بنائیں گے'' ان کی شاہ کار نظمیں ہیں۔

فارسی اور اردو کے شاعر، ادیب، خاکہ نگار اور کالم نویس ڈاکٹر سید عباس متقی پوری زندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں، اور سرکاری مدارس کی اردو نصابی کتب کی تدوین و ترتیب میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں، انہوں نے بہت چھوٹے بچوں کے لئے بھی نظمیں کہی ہیں جو ایک مشکل کام ہے، ان کی ایک نظم ''چڑیا گھر کی سیر'' بہت عرصہ تک آندھرا پردیش سرکاری مدارس کی پہلی جماعت کی درسی کتاب میں شامل رہی ہے۔ ان کی نظمیں بچوں کا ضمیمہ ''گلدستہ'' روز نامہ منصف میں گاہے بگاہے شائع ہوتی ہیں، ان کی نظمیں بچوں کو ذہنی تفریح اور رومان پرور ماحول سے ہم کنار کرتی ہیں، خالص تفریحی نظموں میں بھی وہ سبق آموز پہلو کشید کر لیتے ہیں:

تتلی سے چپ رہنا سیکھو
خاموشی سکھائے تتلی
چڑیا گھر میں سب حیواں ہیں
شکر خدا کا ہم انساں ہیں

مشہور شاعر، مصنف، محقق اور نقاد ڈاکٹر عبدالرؤف خیر ۱۹۶۰ء سے تا حال بچوں اور بڑوں کے لئے لکھ رہے ہیں۔ ان کی ایک نظم ''جب میں اسکول جانے لگتا ہوں'' (کھلونا مارچ ۱۹۷۲ء) حکومت مہاراشٹرا کی چوتھی جماعت کے نصاب میں ۱۹۸۳ء تا ۱۹۹۳ء شامل رہی ہے اور ایک نظم ''ہمالہ'' آندھرا پردیش میں دوسری جماعت کے سرکاری نصاب میں برسوں شامل رہی ہے۔ ادھر چند سالوں سے ان کی نظمیں ماہ نامہ امنگ کے شماروں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اپنی نظموں میں وہ کبھی کوّے کی ہوشیاری بیان کرتے ہیں، پانی اور ہوا کی افادیت و ضرورت پر روشنی ڈالتے ہیں، کبھی مزدور بچہ کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں جو اسکول جانے سے محروم رہتا ہے۔

www.urduacademyts.com

دشتِ آرزو،، کے شاعر لطیف آرزو کو ہیری بچوں کے رسائل امنگ، نور، اور فنکارِ نو وغیرہ میں لکھتے رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء سے وہ بچوں کے لئے نظمیں وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ ''لطیف نظمیں'' کے نام سے انہوں نے مختصر و منتخب مجموعہ ترتیب دیا ہے۔ لطیف آرزو ایک مخلص اور خداترس مومن ہیں۔ ان کی نظموں میں بچوں کو محبت، خلوص، امن، حسنِ عمل، نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کا پیغام ہے۔ انہوں نے بچوں کو گندے ناول اور رسائل سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

مہر و وفا کے پھول کھلاتے رہیں گے ہم
حسنِ عمل کے موتی لٹاتے رہیں گے ہم
امن و اماں کی بچو! دنیا ہے پیاسی کب سے
دنیا کو تم بچاؤ اللہ کے غضب سے

ذکیہ تجلّی (م:۲۰۱۳) بچوں کے ماہ نامہ فنکارِ نو اور گلدستہ ضمیمہ روزنامہ منصف میں ادھر پابندی سے لکھ رہی تھیں، وہ بچوں کے لئے مختصر، دل چسپ اور سبق آموز کہانیوں اور مضامین کے علاوہ نظمیں، حمد و دعا وغیرہ لکھتی تھیں۔ ان کی نظمیں ''اماں'' اور ''میری پوتی منال'' بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہیں:

اماں، اماں، اماں
میں ہوں جان و دل سے قرباں
خدمت کروں گا تیری اماں
قدموں تلے ہے جنت تیرے
جنت ہے تو میری اماں
اماں، اماں، اماں، اماں

بچوں کے کل وقتی شاعر، ادیب اور مضمون نگار حافظ امجد حسین امجد کرناٹکی (پ:۱۹۶۴ء) بچوں کے حالیہ دور میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں، انہوں نے بچوں کے لئے کافی تعداد میں حمد، نعت، منظوم سیرت پاک، رباعیات، قطعات، گیت، ترانے، غزلیں اور لوریاں وغیرہ لکھی ہیں، کثرتِ تصانیف کی بنا پر افتخار امام صدیقی اور محمد فرحت حسین خوشدل نے آپ کو بچوں کی شاعری کا امام قرار دیا ہے۔ بچوں کی شاعری سے متعلق ان کی کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

نورِ وحدت، شمعِ ہدیٰ، ہمارے نبی ﷺ، موجِ تسنیم، طفلستان، معصوم ترانے، چاند گگن، مہکتی کلیاں، گلشن گلشن۔ شبنم شبنم، بلبلوں کے گیت، زمزمے، چمکتے ستارے، صحنِ مسرت، ہندوستان، لوریاں، معصوم غزلیں، ننھی منی غزلیں، صیامستان، فانوسِ حرم، اشک و رشک، رباعیاتِ امجد حصۂ اول، دوم، سوم، لحن، گلپوش جھروکے، آسان بیت بازی وغیرہ۔

حافظ صاحب نے بچوں کے اسلامی ادب میں قابلِ رشک خدمات انجام دی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ریاست کرناٹکا اور مہاراشٹرا کے تقریباً دس دینی مدارس میں آپ کی دس دینی کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ منظوم سیرتِ نبوی ﷺ پر مشتمل آپ کی کتاب ''ہمارے نبی ﷺ'' لکھ کر آپ نے بچوں کی اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے، اس ضخیم مجموعہ میں آپ نے سیرتِ نبوی ﷺ کے تمام اہم واقعات کو آسان اور رواں اسلوب میں قلم بند کیا ہے۔ آپ کی شاعری حفیظ جالندھری، مولانا حالی، عزیز بگھروی اور ابوالمجاہد زاہد حسین کی یاد دلاتی ہے۔ مذہبی و اخلاقی موضوعات کے علاوہ آپ نے بچوں کے لئے سائنس، جغرافیہ، عمرانیات، ماحولیات اور حفظانِ صحت وغیرہ پر بڑی اچھی اور پیاری نظمیں لکھی ہیں۔

حافظ کرناٹکی کے بعد ریاست کرناٹک میں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے ایک اہم اور معتبر نام ظہیر رانی بینوری کا ہے، بچوں کے لئے ان کی شاعری کے چار مجموعے: کلیاں (۱۹۷۶ء) گلاب (۱۹۹۲ء) گلستان (۲۰۰۳) گلشنِ ظہیر (۲۰۱۱ء)، شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے تینوں مجموعے کرناٹکا اردو اکیڈمی سے شائع ہوئے ہیں، جب کہ آخری مجموعہ قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے۔ ان کی نظمیں بچوں کے تمام رسائل میں پڑھنے کو ملتی ہیں، ظہیر رانی بینوری کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے، آسان اور ہلکے پھلکے مصرعوں میں زیادہ تر نظمیں کہی ہیں۔ سبک اور آسان لفظوں پر مشتمل ان کی نظمیں بچوں کے لئے ہرگز گراں بار

www.urduacademyts.com

نہیں ہوتیں، بچے انہیں آسانی سے مزے لے لے کر پڑھتے اور یاد کر سکتے ہیں،انہوں نے کافی مقدار میں حمد،نعت،فرائضِ اسلام،عبادات،مذہبی،قومی، وطنی، اخلاقی،تاریخی اور جدید موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں،نظم ,,کمپیوٹر،، کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کمپیوٹر ہے چیز نرالی　　حیرت والی، جادو والی
روپ ہے اس کا ٹی وی جیسا　　کام ہے اس کا بڑا انوکھا
بٹن دبا کر حرف بناؤ　　بنا قلم کے لکھتے جاؤ
لوگوں کو خبریں پہنچائے　　اوروں کا پیغام یہ لائے

شاکرہ بیگم صبا درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہی ہیں۔بچوں کے ادب سے آپ کو خاصی محبت ہے۔بچوں کے لئے آپ نے کئی نظمیں اور گیت لکھے ہیں۔آپ کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ ''گلدستۂ صبا'' ۲۰۰۱ء میں کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور سے شائع ہوا ہے۔آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ بچوں کو ابتداء ہی سے مذہب،اخلاق اور مہذب سماج کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانا چاہئے تاکہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔یہ کام ابتدائی عمر سے ہی کھیل کود کے طریقے سے اور سلیس نظموں کے پیرایہ میں کرنا چاہئے۔چنانچہ نرسری اسکولوں کے بچوں کے لئے (۵۵) نظموں اور گیتوں کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔اس میں موضوعات کی رنگارنگی ہے۔بچوں کی دل چسپی،ان کی ہمہ جہت معلومات اور ذہنی وفکری نشوونما کا خیال رکھا گیا ہے۔نظم ''نیک بچے کی آرزو'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھ سے رب راضی ہو ہمیشہ　　اس پہ فدا ہے ریشہ ریشہ
سب کے دکھ میں کام میں آؤں　　ہر ایک کو میں سکھ پہنچاؤں
میں نہ کسی کی کروں برائی　　لوں نہ کبھی میں چیز پرائی

کڑپہ آندھراپردیش کے ستار فیضی حالیہ دور میں بچوں کے ایک کامیاب شاعر ہیں۔وہ اپنی ریاست سے بچوں کی شاعری کی کامیاب نمائندگی کررہے ہیں۔ رسائل میں چھپنے کے علاوہ ان کی شاعری کا مجموعہ ''دھنک'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں حمد،نعت،موضوعاتی نظمیں،مختصر نظمیں (ننھی منی نظمیں)،حب الوطنی سے متعلق نظموں کے علاوہ ۳۶ رحرکاتی نظمیں (تحتانوی طلبہ کے لئے) اور قطعات کی ہیئت میں پچاس پہیلیاں ہیں،ستار فیضی کی نظموں کی زبان آسان اور ہلکی پھلکی ہے۔انہوں نے چھوٹے بچوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں لکھ کر قلمی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔

ان کے علاوہ جنوبی ہند میں بچوں کے نظم گو شعراء کا ایک قافلہ ہے،اختصار کے پیشِ نظر ان کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جارہا ہے:

یعقوب اسلم عمری،شاہوار بیگم بیگم،وائی محمد فضل اللہ رومی،الف احمد برق،مشتاق سعید،محمود خاں قیصر،انور عزیز،رضیہ یاسمین راز،ڈاکٹر وحید انجم،شہ نواز بانو یاسمین،ریشماں طلعت شبنم،جلال الدین اکبر،سردار سلیم اور ظفر صدیقی وغیرہ۔

مذکورہ جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرنِ حاضر میں جنوبی ہند میں بچوں کی شاعری کی حالت کسی حد تک بہتر ہے۔اگر مغربی ہند کی ریاست مہاراشٹرا کی طرح جنوبی ہند میں مرعوبیت کے خول سے باہر نکل کر مادرِ مہربان اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر عام کیا جائے تو بڑی تعداد میں قارئین اور اہلِ قلم پیدا ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سیّد اسرار الحق سبیلی
اسسٹنٹ پروفیسر وصدر شعبۂ اردو
گورنمنٹ ڈگری کالج سِدّی پیٹ۔۵۰۲۱۰۳ ریاست تلنگانہ
موبائل:۹۳۴۶۶۵۱۷۱۰،۸۱۴۳۳۴۴۷۵۱

www.urduacademyts.com

عزیز الاخبار۔قدیم حیدرآباد کا نایاب اخبار

شہر حیدرآباد نے بہت سے علمی موتیوں کو اپنے اندر جمع کیا تھا۔ یہاں چونکہ علم وفن کی سرپرستی کی جاتی تھی اس وجہ سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین سارے ہندوستان سے یہاں جمع ہوئے تھے۔اپنے دور کے بڑے بڑے اصحاب کمال ،شاعر اور نثر نویس یہاں آوارد ہوئے اور یہیں آسودۂ خاک ہوگئے۔

عزیز جنگ ولاؔ ایسے ہی ایک انمول اور نایاب رتن ہیں۔ بہت ہی چھوٹے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے صدر محاسب صرف خاص اور مددگار معتمد محکمۂ فینانس کے عہدے پر پہونچ گئے ۔اس میں ان کی انتھک محنت اور کوشش کا دخل نہیں ہے تو کیا ہے؟ بہت سے فنون میں عزیز جنگ ولاؔ مہارت تامہ رکھتے تھے۔ پرانے دور میں ایک لفظ بولا جاتا تھا 'قاموسی شخصیت' یعنی ایسی شخصیت جو بہت سے علوم وفنون کی ماہر ہو۔اس کا اطلاق عزیز جنگ ولاؔ پر کیا جاسکتا ہے۔

ولاؔ کا نسب حضرت سیدنا جعفر طیارؓ سے جاملتا ہے۔آپ ۲۸ ستمبر کو بمقام نیلور پیدا ہوئے۔۹ سال کی عمر میں والد مولوی محمد نظام الدین کے ہمراہ نواب سرسالار جنگ مختار الملک بہادر مدار المہام کے طلب کرنے پر تشریف لائے، اپنے وقت کے ممتاز اساتذہ سے انہوں نے اخذ علم کیا۔فارسی مولوی سید شجاعت علی صاحب اور مولوی محمد حسین راقم سے سیکھی، فارسی شاعری میں اپنا استاد ذکا نلوری، معنی، راقم، افضل وسنجر طہرانی کو بنایا۔ان اساتذہ کی محنت اور خود ان کے ذوق و شوق نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو شاعری میں اپنے وقت کے کاملان فن کی رہنمائی انہیں حاصل رہی ہے۔چند اساتذہ کے نام یوں ہیں:

کامل لکھنوی، قدر بلگرامی، سالک ،داغ دہلوی ،جلیل مانک پوری اور اختر مینائی۔

ان کی تصانیف کی فہرست پر نظر ڈالنے سے حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے اتنے مختلف علوم وفنون میں کس طرح مہارت حاصل کی اور باقاعدہ تصانیف تحریر کردیں۔

آپ نے تیرہ سے زائد کتابیں لکھیں جن میں سے چند کتابوں کی فہرست یوں ہے:

مجموعۂ احکام و فینانس، عطیات آصفیہ، شیرازۂ دفاتر، تاریخ النوائط، سیاق دکن، ترکاری کی کاشت، کھجور کی کاشت، کاشت انگور، غرائب الجمل، احویۃ الحمام، سیاق دکن۔

آصف اللغات ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کی تقریباً ۱۴ جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور ہر جلد پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔لیکن حیات نے آپ کو اس کام کی تکمیل کی اجازت نہیں دی۔اور آپ ۱۳۴۳ ہجری میں انتقال کرگئے ۔فصاحت جنگ جلیل مرحوم نے آپ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا اور اس مصرعے سے ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے:

بیاو بیں کہ ہمین است خوابگاہ ولاؔ

www.urduacademyts.com

آپ کی عبقریت پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب محمد عمر صاحب مہاجر نے مرقع سخن جلد دوم میں لکھا ہے:

''کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں ہر قسم کی معلومات بہم پہونچانے واحد ذریعہ حیدرآباد میں صرف نواب عزیز جنگ کی ذات تھی۔اس زمانے کے مصنفین ومولفین کو ان کے وجود سے گرانقدر مدد ملتی رہی۔ان کی زندگی حیدرآباد کی ایک ایسی زندہ تاریخ تھی جس میں یہاں کی معاشرت، یہاں کے رسم ورواج اور یہاں کے علمی کارناموں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں''

(مرقع سخن ،جلد دوم، مدیر عمومی: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، طابع: مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن، سن اشاعت: ۱۹۴۷، ص:۲۰۲)

مولف محبوب الزمن تذکرۂ شعراء دکن عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری کی رائے بھی ان کی شخصیت کے بارے میں تقریباً یہی ہے کہتے ہیں:

''میں سچ کہتا ہوں کہ جناب والا صاحب ترجمہ واقع میں عزیز الوجود ہیں، مغتنمات میں سے ہیں، خدائے تعالی آپ کو سلامت رکھے، آپ سراپا قوم کے ہمدرد وخیر خواہ ہیں، آپ کی ذات بابرکات سے قوم کو بے شمار فائدہ پہونچ رہا ہے۔آپ رات دن نفع عام کی غرض سے تالیف وتصنیف کی فکر میں باوجود بیماری وناتوانی ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ ذاتی سرمایہ کا بڑا حصہ اسی تصنیف و تالیف میں صرف کررہے ہیں''۔(مرقع سخن تذکرۂ شعراء دکن ،جلد دوم، مولف:عبدالجبار خان صوفی ملکاپوری ،ناشر:مطبع رحمانی، سن اشاعت:۱۳۲۹ہجری،ص:۱۱۷۲)

علامہ شبلی نعمانی،الطاف حسین حالی ،عماد الملک بلگرامی نے ان کی تصانیف پر تقاریظ لکھی ہیں اوران کی بے حد تعریف کی ہے۔

تاریخ النوائط کی تقریظ لکھتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی نے نواب صاحب کی علمیت، تحقیق وجستجو،ان کی کدوکاوش کو بہت سراہا ہے۔کہتے ہیں:

''یہ کتاب اسی خاندان کے بارے میں عزیز جنگ بہادر کی تصنیف ہے اگرچہ کہ نواب صاحب کو اس مرحلے کے طے کرنے میں بعض قدیم تصنیفات سے مدد ملی ہے کیونکہ خود اسی خاندان کے مصنفین نے انساب النوائط وغیرہ کے عنوان سے ایک دو کتابیں لکھی ہیں، جو اس مرحلہ میں گویا چراغ راہ ہیں۔لیکن نواب صاحب نے جس قسم کے حالات وواقعات بہم پہونچائے ہیں ان کے لحاظ سے یہ تصنیف گویا اس باب میں پہلی تصنیف ہے۔کتاب کے دیباچے سے بآسانی اس بات کی تصدیق ہوسکتی ہے''

(تاریخ النوائط، عزیز جنگ ولا، ناشر:ولا اکیڈمی ،حیدرآباد، سن اشاعت:۱۹۷۶ء،ص:۳۲۵۔۳۲۶)

حیدرآباد میں صحافت کی ابتداء ۱۸۵۵ سے ہوتی ہے ۔جب وہاں سے ایک سہ ماہی رسالہ طبابت کے نام جاری ہوا جس کے ایڈیٹر جارج اسمتھ تھے۔مولوی نصیرالدین ہاشمی کے مطابق حیدرآباد کا سب سے پہلا ہفت روزہ اخبار

صحافت

www.urduacademyts.com

آصف الاخبار ہے جو ۱۸۷۸ء میں جاری ہوا اس کے ایڈیٹر نارائن راؤ تھے ۔دوسری طرف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی کتاب صحافت ہندوستان و پاکستان میں میں لکھا ہے خورشید دکن حیدرآباد کا پہلا اخبار ہے جو ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا اور اس کے ایڈیٹر مرزا کاظم تھے۔ (دیکھئے: جنوبی ہند کی اردو صحافت، از: محمد افضل الدین اقبال، ناشر: معین پبلکیشنز، حیدرآباد، سن اشاعت: ۱۹۸۱ء ص: ۳۷)

عزیز جنگ ولا نے دو رسالے نکالے ۔پہلا تو ہفت روزہ اخبار ہے جس کا نام اپنے ہی نام پر عزیز الاخبار رکھا۔دوسرا ماہنامہ نکالا جس کا نام لسان الہند والعجم رکھا۔ عزیز الاخبار میں حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کی خبریں شائع ہوا کرتی تھیں۔نیز اس میں فینانس ،حساب سے متعلق بھی مضامین شائع ہوتے تھے۔چونکہ آپ فینانس کے ماہر تھے اور اس موضوع پر ان کی ضخیم تصنیف مجموعۂ احکام و فینانس مالگزاری بھی طبع ہو چکی تھی۔اس لئے آپ کے مضامین بہت پسند کئے جاتے تھے اور اپنے موضوع پر مستند بھی مانے جاتے تھے۔اخبار جب چھپنا شروع ہوا تو خاص و عام میں بہت مقبول ہوا۔دن بہ دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔عزیز الاخبار کے بارے میں خود عزیز جنگ ولا لکھتے ہیں:

''ایک معینہ مدت تک میں ایک موقت الشیوع ہفتہ واری رسالہ کا پروپرائٹر رہ چکا ہوں ۔جس کا نام عزیز الاخبار تھا ۔اس میں بیرونی خبروں کے علاوہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی خبریں اور قانون مال وفینانس کے مضامین رہا کرتے تھے۔اس کا سالانہ چندہ بقدر مصارف طبع تھا۔اس اخبار کے جاری کرنے سے مقصد صرف یہی تھا کہ پبلک کو مدد ملے، زمانے کی آب وہوا نے اس پودے کو آزادیٔ رائے کے ساتھ سرسبز ہونے نہ دیا اور میں نے ناگوار پابندیوں کے ساتھ اس کے جاری رکھنے پر بند رکھنے کو فائق خیال کیا''۔ (حیوۃ العزیز، عزیز جنگ ولاؔ، مطبع: عزیز المطابع حیدرآباد، ص:۹)

اس اقتباس کے دو نکات کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا: ایک یہ کہ آزادیٔ رائے کے ساتھ زمانے کی آب و ہوا نے اس پودے کو سرسبز ہونے نہ دیا۔بہت ہی اشاروں میں انہوں نے کہا ہے کہ سرکار کی طرف سے ایسی خبریں شائع کرنے پر پابندی عائد کردی گئی جو نواب صاحب کی طبع نازک پر گراں گزریں یا جس سے ان کے کسی فیصلے پر زد پڑے۔ ظاہر ہے وہاں جمہوریت تو نہ تھی۔نواب ہی قانون تھا۔ فانیؔ بدایونی اور جوشؔ اور دیگر باکمالوں کی چھوٹی سی خطا پر ۲۴ گھنٹوں کے اندر ملک بدر کرنے کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ ہماری اس بات کی تائید آگے آنے والا جملہ بھی کر رہا ہے جس میں ناگوار پابندیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔عاقلے اشارہ کافی است۔

برق موسوی کی کتاب یادگار رولاؔ کے نام سے فارسی میں شائع ہوئی ہے جس میں انہوں نے عزیز الاخبار کے بند ہونے کی سبب پر روشنی ڈالی ہے۔برق موسوی کا اقتباس دیکھ لیجئے:

صحافت

www.urduacademyts.com

''ولا درسنہ ۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۰۲ میلادی بہ انتشار روزنامۂ عزیز الاخبار مبادرت جست ولی حق گوئی و بے باکی او حکامان دولتی را ناراحت ساخت بالخصوص شحنۂ شہر نواب اکبرالملک حریت قلم ولا را پسند نہ کرد۔ کار بجای رسید کہ ولا ناچار روزنامۂ خود را مسدود کرد''۔ (یادگار ولا ، برق موسوی، ص:۱۷)

اس اقتباس کا ترجمہ یوں ہے:

ولا نے سن ۱۳۳۰ ہجری مطابق ۱۹۰۲ء میں عزیز الاخبار کے نام سے ایک روزنامہ نکالا لیکن ان کی حق گوئی وبے باکی نے ریاست کے حکمرانوں کو پریشان کردیا۔ خاص کر محافظ شہر نواب اکبرالملک کو اُن کے قلم کی آزادی ایک آنکھ نہ بھائی۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ ولا کو یہ روزنامہ بند کرنا پڑا۔

اصل میں یہ ہفت روزہ تھا یا روزنامہ؟

برق موسوی اس اخبار کو روزنامہ کہتے ہیں جبکہ ولا اسے ہفت روزہ کہتے ہیں۔ صاحب معاملہ خود کہتے ہیں کہ ہفت روزہ ہے تو انہیں کی بات کا اعتبار کیا جائے گا۔ نیز طیب انصاری صاحب نے بھی اپنی کتاب حیدرآباد میں اردو صحافت میں اسے ہفت روزہ ہی لکھا ہے نہ کہ روزنامہ۔ برق موسوی کو تسامح ہوا ہے' انہوں نے دو جگہ غلطی سے ہفت روزہ کو روزنامہ لکھ دیا ہے۔

عزیز جنگ ولا کی حق گوئی و بے باکی کی وجہ اس اخبار کو بہت شہرت ملی۔ انہوں نے اس اخبار کے اجراء میں بہت محنت کی اور مضامین بہت ہی معیاری انداز کے اس میں شائع ہوتے تھے۔ جناب طیب انصاری عزیز الاخبار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیز جنگ ولا اپنے وقت کے ممتاز شاعر اور صاحب قلم ادیب تھے۔ ان کی ہمہ دانی نے ان کو شہرت کے عروج پر پہونچایا۔ نثر نظم میں ید طولی رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی ان ہی گوناگوں خصوصیات کی جھلک ان کے اخبار عزیز الاخبار اور تکمیل الاحکام میں ہمیں نظر آتی ہے۔ ۱۹۰۰ء میں یہ ہفتہ وار جاری ہوا۔ اور بہت جلد اپنی خصوصیات اور جدت پسندی کی وجہ سے عوام میں مقبول ہوا۔ یہ ہفتہ وار عزیز باغ واقع سلطان پورہ سے ان ہی کے مطبع عزیز المطابع سے چھپ کر منظر عام پر آتا تھا''۔ (حیدرآباد میں اردو صحافت، طیب انصاری، ناشر: اعجاز پرنٹنگ پریس حیدرآباد، اشاعت: ۱۹۸۰ء، ص:۱۰۴)

اس میں دورائے نہیں ہے کہ یہ اخبار عوام کی مدد کے لئے نکالا گیا تھا لیکن دوسال کی مدت کے بعد اس اخبار کو موقوف کردیا گیا۔

ظہیر دانش عمری
پی ایچ۔ ڈی ریسرچ اسکالر
مکان نمبر: 8/209-5' الماس پیٹ'
بسم اللہ نگر' کڑپہ۔ 516001

صحافت

www.urduacademyts.com

غزلیں

سید مسرورؔ عابدی

پہلے جو تھی وہ رسم وفا اور بڑھ گئی
کیا اُن کی یاد اُن کے سوا اور بڑھ گئی

تھا داستانِ غم کا طویل اتنا سلسلہ
ہر بات ختم ہوکے ذرا اور بڑھ گئی

پردہ بنی تھی حسرتِ دیدار درمیاں
اُن سے نظر ملی تو حیا اور بڑھ گئی

دامن سلگ اٹھا جو گلوں کا بہار میں
کیاجانے کیا ہوا کہ صبا اور بڑھ گئی

بالیں سے کون گزرادبے پانوں اسقدر
پچھلے پہر جو دل کی صدا اور بڑھ گئی

عذرِ جفا سے چل نہ سکا کام جب کوئی
ترکِ جفا سے اُن کی جفا اور بڑھ گئی

مسرورؔ کیوں ہے ترکِ مراسم کی آرزو
اُن سے محبت آپ کی کیا اور بڑھ گئی

oOo

بیت الغزل

چنچل گوڑہ، حیدرآباد 059 500

منورالنساء منورؔ

دوست اچھا ہو تو رُت خود ہی نکھر جاتی ہے
بات سچی ہو تو پھر دل میں اتر جاتی ہے

دل کشی اتنی سرا پے میں ہے جا دو اتنا
لاکھ روکوں میں مگر اس پہ نظر جاتی ہے

دن گذرتا ہے کبھی دھوپ کبھی بارش میں
رات آتی ہے مرے گھر میں ٹھہر جاتی ہے

اس قدر میں نے مقدر کی سیاہی دیکھی
روشنی آنکھ میں آتی ہے بکھر جاتی ہے

اک ترے غم کے سوا کچھ بھی نہیں دنیا میں
زندگی یوں بھی گذرنی ہے گذر جاتی ہے

وہ بجھانا بھی اگر چاہے منورؔ ہوں میں
میری تنویر سے تقدیر سنور جاتی ہے

oOo

مکان نمبر:8-1-523/22، برنداون کالونی
ٹولی چوکی، حیدرآباد۔ 500 008

www.urduacademyts.com

غزلیں

رئیس صدیقی

فلسفہ یہ عشق کا سُنتے ہیں اچھا کچھ نہیں
ہر قدم دشواریاں ہیں اور دیکھا کچھ نہیں

میں نے چاہا داستانِ غم غزل میں ہو رقم
آبروئے عشق رکھنی تھی ،تو لکھا کچھ نہیں

ہر قدم ،اس کی محبت میں رہے گا گامزن
زندگی کس موڑ پہ جائے گی، سوچا کچھ نہیں

ہم محبت کے سپاہی تھے، فقط اس واسطے
نفرتوں کے درمیاں بھی ،ہم نے دیکھا کچھ نہیں

یہ حقیقت ہے، حقیقت پر کروں کیا تبصرہ
'موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں'

یہ زمیں اقبالؔ کی اور شعر کہنا ہے رئیسؔ
اِک بڑے فنکار کے آگے، یہ چھوٹا کچھ نہیں

-ooo-

سابق آئی بی ایس افسر' آکاشوانی ودوردرشن
Mob:9810141528

مختارؔ ٹونکی

جب بھی انساں کو تڑپتا دیکھوں
قلب گیتی کو ڈھڑکتا دیکھوں
تیرا چہرہ ہی تھرکتا دیکھوں
اشک پلکوں پہ لرزتا دیکھوں
ماں کی آنکھوں کو چمکتا دیکھوں
جب بھی بچے کو ہمکتا دیکھوں
چاندنی تیری بلائیں لیتی
چاند قدموں پہ اترتا دیکھوں
یاد خوشبو ہے چنبیلی جیسی
دل کے آنگن کو مہکتا دیکھوں
پُر ہیں اشکوں سے یہ آنکھیں میری
کیسے ساون کو برستا دیکھوں
زندگی ست ہوئی جاتی ہے
وقت تیزی سے گزرتا دیکھوں
خار و خس اور مہ و انجم میں
عکس اس کا ہی جھلکتا دیکھوں
جانے کیا ڈھونڈ رہا ہے مختارؔ
اس کو در در میں بھٹکتا دیکھوں

-ooo-

کالی پلٹن روڈ' پل محمد خاں' ٹونک'
(راجستھان)۔ 304001

www.urduacademyts.com

غزلیں

عابد رشید- شکاگو امریکہ

میرا انداز زمانے سے نرالا کردے
ایک ہی شعر سہی، میرا حوالہ کردے

یہ تو اک ہاتھ کی جنبش میں ہے کوزہ گر کی
وہ جو چاہے تو صراحی کو پیالا کردے

کبھی ماضی تو کبھی کھوج میں مستقبل کی
آنکھ دی ہے تو مجھے دیکھنے والا کر دے

لوگ اطراف سے بن دیکھے گزر جاتے ہیں
اب بھی زندہ ہوں مری موت دوبالا کردے

کتنے ہاتھوں سے گزرتا ہوا مجھ تک پہنچا
جو مرے ہاتھ میں ہے میرا نوالہ کردے

کیسے خدشات ہیں سچ ہوتے چلے جاتے ہیں
کاش کوئی میری سوچوں میں گھٹالا کردے

ہو مری آخری خواہش بھی کسی کی خاطر
مجھ کو اک ایسا دعا مانگنے والا کر دے

ایک منظر ہے مگر زاویہ اپنا اپنا
کہیں جالا کہیں آنکھوں میں اُجالا کردے

پس گیا وقت کی چکی میں کہیں اپنا پن
کوئی آئے مجھے پھر چاہنے والا کر دے

-ooo-

سیفؔ نظامی (حیدرآباد)

بڑی مشکلوں سے ٹھہرا دل مضطرب ہمارا
اۓ خیال دوست اس کو نہ بکھیرنا دوبارا

مرے ڈوبنے ابھرنے پہ یہ تبصرے کہاں تک
ذرا پاس آکے دیکھو کبھی چھوڑ کر کنارا

نہ یہ دامن طلب ہے نہ یہ کاسئہ گدائی
یہ کہاں سے بھر سکے گا یہ ہے زخمِ دل ہمارا

کبھی اُس کی لاج رکھ لی، کبھی دل کی بات مانی
کبھی جیت کر نہ جیتا، کبھی ہار کر نہ ہارا

ہمیں نقش رفتگاں بھی ہیں بہت عزیز لیکن
ذرا اُن سے مختلف ہی رہا راستہ ہمارا

کہا آنکھ نے زباں سے یہ ہے ظرف اپنا اپنا
تو نے کھل کے بات کہہ دی میں نے کر دیا اشارا

جسے حسن ہم نے سمجھا وہ ہے عکس حال دل کا
ہو سکون دل میسر تو حسیں ہے ہر نظارا

-ooo-

مکان نمبر:6-3-1177/A/54، کندن باغ،
بیگم پیٹ، حیدرآباد۔16

جناب محمد خواجہ مجیب الدین عزت مآب صدر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی نے اُردو اکیڈیمی کے عہدیداران واراکین عملہ کے تعارفی اجلاس سے خطاب کیا۔اس موقع پر لی گئی تصویر

Urdu Monthly
Qaumi Zaban
AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY
Vol. 07 No. 08 August 2022

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

جناب محمد خواجہ مجیب الدین نے 21 جولائی 2022ء کو صدر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی حیثیت سے عہدہ کا جائزہ حاصل کیا۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں محترمہ کے۔ کویتا معزز رکن قانون ساز کونسل، جناب محمد محمود علی عزت مآب وزیر داخلہ، محابس و فائر سرویسیز حکومت تلنگانہ، جناب کوپولہ ایشور عزت مآب وزیر برائے درج فہرست طبقات، اقلیتی بہبود، بہبودی معمرین و معذورین حکومت تلنگانہ، جناب وی پرشانت ریڈی عزت مآب وزیر عمارات و شوارع حکومت تلنگانہ، جناب مسیح اللہ خان چیرمین تلنگانہ اسٹیٹ وقف بورڈ، جناب امتیاز الحق چیرمین تلنگانہ اقلیتی مالیاتی کارپوریشن و دیگر احباب دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone: 040-23237810, 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation Website: www.urduacademyts.com